محمود، فاروق، فرزانہ اور انسپکٹر جمشید کے کارنامے

جاسوس ہو تو ایسا

اشتیاق احمد

اٹلانٹس پبلکیشنز

السلام علیکم!

اس بار کی کہانی اگر آپ کو ہر لمحے کروٹ پر کروٹ بدلتی محسوس ہو تو آپ خود بھی کروٹیں بدلنا نہ شروع کر دیجیے گا، کہیں ایسا نہ ہو کہ صبح آپ کے ابو امی آپ کو ڈاکٹر کے پاس لے جائیں اور کہیں کہ ڈاکٹر صاحب، ذرا دیکھیے تو ہمارے لعل کو نہ جانے کیا ہوا ہے۔ تمام رات بستر پر کروٹیں بدلتا رہا ہے۔ آپ یقین جانیے، ڈاکٹر صاحب بیماری تلاش کرنے میں ناکام ہو جائیں گے۔ یوں تو آج کل ڈاکٹر صاحبان بیماری کی تلاش میں نکلتے ہی کب ہیں۔ مریض سے پوچھتے ہیں، ہاں بھئی، تمہیں کیا تکلیف ہے۔ تکلیف سنتے ہی نسخہ لکھ دیتے ہیں، اللہ اللہ خیر صلا۔ یہی تو وجہ ہے کہ آج کل ہر طرف بیمار ہی بیمار نظر آتے ہیں، لیکن ان میں کچھ ذہنی بیمار بھی ہوتے ہیں۔ ان دنوں مجھے ہر وقت ایسا محسوس ہوتا رہتا ہے، جیسے میں بھی کچھ ذہنی بیماروں کے چکر میں آ گیا ہوں، خدا محفوظ رکھے۔ لیجیے، اب تیار ہو جائیے کروٹیں بدلنے کے لیے، ذرا دیکھیے تو یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے اور پھر مجھے بھی خبر دیجیے۔

اشتیاق احمد

اندر لے آؤ

محمود اور فاروق کے اٹھتے قدم رک گئے۔ ان کے سامنے تین آدمی کولہوں پر ہاتھ رکھے ٹانگیں پھیلائے کھڑے تھے۔ اگر بات صرف اتنی ہوتی کہ تین آدمی ان کے سامنے آ کر کھڑے ہو جاتے تو یہ ایسی کوئی خاص بات نہ ہوتی، کیونکہ تین آدمی راستہ پوچھنے کے لیے بھی ان کے سامنے رک سکتے ہیں۔ کسی ضرورت کے تحت بھی ان کا راستہ روکا جا سکتا ہے، لیکن بات صرف اتنی نہیں تھی، ان تینوں کے چہروں پر بڑی بڑی مونچھیں تھیں، گلوں میں رومال بندھے تھے۔ تنگ پتلونیں اور جیکٹیں پہنے ہوئے تھے۔ ہونٹوں میں سگریٹ سلگ رہے تھے، جنہیں ہاتھ لگانے کی انہوں نے شاید ضرورت محسوس ہی نہیں کی تھی۔ تینوں وحشیانہ انداز میں مسکرا رہے تھے۔ غرض ہر لحاظ سے ان کے تیور خوف ناک تھے۔

گرمیوں کی چھٹیاں تھیں۔ ان دنوں تینوں چھٹیوں کا کام صبح سویرے کر لیتے تھے۔ شام کو فرزانہ تو اپنی امی کے ساتھ گھر کے کام کاج میں لگ جاتی، محمود اور فاروق شام کی سیر کے لئے نکل جاتے۔ ان دنوں ان پر شام کی سیر کا بھوت بری طرح سوار تھا سیر کے لیے آتے بھی تھے جنگل کی طرف، جہاں دور دور تک کوئی انسان نظر نہ آتا۔ ہرے بھرے درخت ہوتے، ٹھنڈی ٹھنڈی

ہوا ہوتی اور بس وہ ہوتے، باتیں کرتے دور تک چلے جاتے اور باتیں کرتے واپس آجاتے۔ سونے پر سہاگا یہ کہ ان دنوں کسی چکر میں الجھے ہوئے نہیں تھے۔

آج بھی وہ شام کو سیر کرتے شہر سے دور آگئے تھے اور گھنا جنگل شروع ہو گیا تھا۔

''یار فاروق، یہ چکر تو جیسے کچھ سو سے گئے ہیں۔''

''سوسے گئے ہیں۔ کیا مطلب۔ یہ لفظ میں نے آج زندگی میں پہلی بار سنا ہے، سوسے۔'' فاروق نے آنکھیں نکالیں۔

''سوسے نہیں۔ سو سے گئے ہیں۔'' محمود نے بھنا کر کہا۔

''اوہ سمجھا، تو بھئی اگر چکر سو گئے ہیں یا سو سے گئے ہیں تو ہمارے لیے تو خوشی کا مقام ہونا چاہیے، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے، تم اس خوشی کے مقام کو فکر اور پریشانی کے مقام سے بدل دینے پر تلے ہو۔ آخر یہ سکون گھر میں آرام دہ ماحول میں سکول کا کام، آپس کی نوک جھوک، یہ سب کیا تمہیں کاٹ کھانے کو دوڑنے لگا ہے۔'' فاروق جلے کٹے انداز میں کہتا چلا گیا۔

''نہیں، مجھے کوئی چیز بھی کاٹ کھانے کو نہیں دوڑ رہی، سوائے تمہارے۔ یوں لگتا ہے جیسے تم مجھے کاٹ کھانا چاہتے ہو۔'' محمود نے بھی تلملا کر کہا۔

''تم کوئی میرے پسندیدہ پھل نہیں ہو۔'' فاروق نے منہ بنایا۔

''خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میں پھل نہیں؛ ورنہ تم جیسا ندیدہ تو مجھے ہضم بھی کر چکا ہوتا۔'' محمود نے جلدی سے کہا۔

''یار یہ ندیدہ کیا ہوتا ہے۔'' فاروق اس طرح بولا جیسے اس کے

جملے کی طرف توجہ ہی نہ دے سکا ہو۔

''ہم اس وقت اردو کی تیاری نہیں، شام کی سیر کر رہے ہیں۔'' محمود نے گویا یاد دلایا۔

''ہائیں، تم نے مجھے کیا کہا تھا، ندیدہ؟'' فاروق نے خونخوار نظروں سے اسے گھورا۔

''اتنے لال پیلے کیوں ہو رہے ہو، جب تمہیں ندیدہ کا مطلب ہی نہیں آتا۔'' محمود ہنسا۔

''کسی حد تک تو مطلب سمجھتا ہی ہوں۔ اپنے الفاظ واپس لو، ورنہ میری اور تمہاری اسی جگہ جنگ شروع ہو جائے گی اور اس جنگ کو اس جنگل میں دیکھنے والا بھی کوئی نہیں ہوگا۔''

''کیوں ہوگا کیوں نہیں۔ یہ چرند پرند اور دوسرے جانور تو بہت شوق سے دیکھیں گے، آپس میں کہیں گے، دیکھو، اب انسان بھی ہم جیسی حرکتوں پر اتر آئے۔'' محمود نے جھلائے ہوئے انداز میں کہا۔

''آج سے اتر آئے ہیں۔ یہ تو روز ازل سے ہو رہا ہے بھئی۔ کیا تم ہابیل اور قابیل کی لڑائی کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔'' فاروق حیرت زدہ لہجے میں بولا۔

''اور تم انہیں کی یاد تازہ کرنے کا پروگرام بنا رہے ہو۔''

''نہیں خیر، میں اس حد تک جانے کا ارادہ نہیں رکھتا۔''

''خدا کا شکر ہے، تم اس حد تک گئے گزرے نہیں ہو۔'' محمود بھرپور انداز میں مسکرایا۔

''دیکھو، لفظی چوٹیں نہ کرو، عملی قدم اٹھاؤ تاکہ میں بھی تمہیں منہ توڑ

''ابھی تھوڑی دیر پہلے تو میری زبان کے بارے میں کچھ اور کہہ رہے تھے۔''

''اف خدا میں کیا کروں۔''

''جو کچھ یہ شریف آدمی کہہ رہے ہیں، اس پر عمل کرو، یہی ہمارے لیے بہتر ہے۔'' فاروق نے کہا۔

''تمہارے بھائی کا مشورہ نیک ہے۔ سیدھی طرح ہمارے ساتھ چلو۔'' تین میں سے ایک بولا۔

''تو پھر میرے بھائی کو ہی لے جاؤ۔ مجھے تو معاف ہی رکھو۔ ابھی میں نے سکول کا کام بھی نہیں کیا۔'' محمود نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

''تمہارے بغیر تو میں جانے سے رہا۔''

''تم دونوں شاید باتوں میں وقت ضائع کرنا چاہتے ہو۔ ہم تمہارے حربوں سے خوب واقف ہیں۔ باس نے ہمیں تمہارے بارے میں ایک ایک بات بتا دی ہے۔ وقت ضائع کر کے بھی کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ آؤ، ہمارے ساتھ آگے آگے چلو۔''

''تو ہم پیچھے پیچھے کیوں نہ چلیں۔'' فاروق جلدی سے بولا۔

''فاروق، یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ ہم ان کے ساتھ نہیں جائیں گے۔'' محمود نے تیز آواز میں کہا۔

''کیا کہا، نہیں جائیں گے۔ پہلے کیوں نہیں بتایا تھا۔ اچھا تو جناب، ہم دونوں تم تینوں کے ساتھ نہیں جائیں گے۔'' فاروق نے گویا فیصلہ سنایا۔

''ہم بھی دیکھتے ہیں، کیسے نہیں جاتے۔''

''دیکھنے کے بعد ہمیں بھی بتا دینا کہ ہم کیسے تمہارے ساتھ نہیں

گئے۔'' فاروق بھلا کہاں چپ رہنے والا تھا۔

اس کے ان الفظ کے ساتھ ہی وہ تینوں ان دونوں کی طرف بڑھے۔

☆☆

دروازے کی گھنٹی بجی۔ پانچ بجنے میں ابھی کچھ دیر تھی، اس لیے یہ انسپکٹر جمشید تو ہو نہیں سکتے تھے۔ محمود اور فاروق کے لوٹنے میں بھی ابھی اتنا ہی وقت تھا جتنا کہ ان کے آنے میں۔ وہ ان سے ایک آدھ منٹ پہلے ہی آیا کرتے تھے، لہذا گھنٹی بجانے والے وہ بھی نہیں ہو سکتے تھے، ضرور کوئی اور تھا، کیونکہ ان کا تو یہ انداز بھی نہیں تھا۔ فرزانہ نے اپنی امی کی طرف دیکھا اور پھر اٹھ کر درواہ کھولنے چلی گئی۔ بیگم جمشید بھی دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔ جوں ہی دروازہ کھلا، ہسپتال کی وردی میں ملبوس دو آدمی نظر آئے۔

''یہ انسپکٹر جمشید کا ہی گھر ہے نا۔''

''جی ہاں، کیا بات ہے، خیر تو ہے۔'' فرزانہ نے جلدی سے کہا۔ ان کے پیچھے انہیں ہسپتال کی ایک گاڑی بھی کھڑی نظر آئی تھی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

''محمود اور فاروق ایک صاحب کو جنگل کے کنارے شدید زخمی حالت میں ملے ہیں۔ وہ شریف آدمی انہیں ہسپتال چھوڑ گیا ہے۔ ہوش میں آنے پر انہوں نے یہاں کا پتا بتایا! چنانچہ ہم آپ کو اطلاع دینے چلے آئے۔ اگر آپ کے پاس گاڑی کا بندوبست نہ ہو تو ہمارے ساتھ بھی چل سکتی ہیں۔''

''لیکن انہوں نے آپ کو فون نمبر کیوں نہیں بتایا۔ آپ ہمیں فون کر سکتے تھے۔''

''انہوں نے تو فون نمبر بتایا تھا، لیکن ہسپتال کے عملے کا اصول ہے کہ ایسی اطلاعات فون پر نہیں دیتے، کیونکہ اس طرح اور حادثات ہو جاتے ہیں۔ عزیز رشتے دار اندھا دھند ہسپتال کی طرف دوڑ پڑتے ہیں۔''

''یا اللہ رحم، ان کی حالت کیسی ہے؟''

''چوٹیں خطرناک نہیں ہیں؛ تاہم خون کافی بہہ گیا ہے، انہیں خون دینا پڑے گا۔''

''تو پھر چلیے۔'' یہ کہہ کر فرزانہ اندر کی طرف دوڑی۔ ادھر سے پہلے ہی بیگم جمشید آ رہی تھیں۔

''میں نے سب کچھ سن لیا ہے بیٹی، حوصلہ رکھو۔'' انہوں نے کہا۔ اور اس کے ساتھ باہر نکل آئیں۔ انہیں وین کے پچھلے حصے میں بٹھایا گیا۔ پچھلا دروازہ بند کر کے دوسرا آدمی ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا اور وین چل پڑی۔ رخصت ہونے سے پہلے بیگم جمشید نے گھر کے دروازے کو تالا لگا دیا تھا۔

''ہم نے یہ غلطی کی کہ بیگم شیرازی کو نہیں بتایا۔ اب تمہارے ابا جان آ کر پریشان ہوں گے۔'' بیگم جمشید بولیں۔

''کوئی بات نہیں امی جان، ہم ہسپتال سے انہیں فون کر دیں گے، بلکہ ابا جان کو بھی فون پر اطلاع دے دیں گے۔ وہ کمزور اعصاب کے مالک نہیں ہیں کہ اندھا دھند جیپ چلانا شروع کر دیں گے۔''

''ہوں ٹھیک ہے۔'' انہوں نے قدرے مطمئن ہو کر کہا۔

''وین بہت تیز چل رہی تھی۔ ڈرائیور اور اس کا ساتھی انہیں نظر نہیں آ رہے تھے؛ البتہ وہ شیشے میں سے باہر کا منظر دیکھ رہے تھے۔ اچانک فرزانہ چونک اٹھی۔ اس نے وین کی دیوار کو زور سے دھڑ دھڑا ڈالا۔ دیوار میں ایک

سوراخ نمودار ہوا۔

''کیا بات ہے؟''

انہوں نے اس آدمی کی آواز سنی، جس نے دروازے پر ان سے بات کی تھی۔

''یہ آپ وین کس طرف لے جا رہے ہیں۔ اس طرف کونسا ہسپتال ہے؟''

''جنگل سے نزدیک ترین پرائیوٹ نیشنل ہسپتال ہے۔ اس شریف آدمی نے ان دونوں کو وہیں پہنچایا تھا۔ ان حالات میں زخمیوں کو نزدیک ترین ہسپتال میں ہی پہنچایا جاتا ہے۔''

''اوہ، ٹھیک ہے شکریہ۔'' فرزانہ نے کہا اور سوراخ بند ہو گیا۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد وہ جنگل کے کنارے ہی پہنچ گئے۔ لیکن اب بھی کسی ہسپتال کے آثار دکھائی نہ دیے تو فرزانہ ایک بار پھر پریشان ہو گئی۔ اس نے دیوار کو پھر دھڑ دھڑانا شروع کر دیا۔

اس مرتبہ سوراخ بہت باریک سا نمودار ہوا اور اس میں سے کوئی تیز بو والی گیس اندر داخل ہوئی۔

''اوہ۔ امی جان ہم سے دھوکا کیا گیا ہے۔'' فرزانہ نے خوش ہو کر کہا۔

''دھوکا کیا گیا ہے اور تم خوش ہو رہی ہو۔'' بیگم جمشید چونک کر بولیں۔

''یہ خوش کی بات ہی تو ہے کہ محمود اور فاروق زخمی نہیں ہوئے۔'' اس نے کہا۔

'' لیکن وہ بھی شاید ان لوگوں کے قبضے میں ہوں گے۔'' انہوں نے
فکر مندانہ لہجے میں کہا۔

'' پروا نہیں، دیکھا جائے گا، لیکن میں حیران ہوں کہ یہ لوگ کیا
چاہتے ہیں؟''

'' یہ بھی ......'' بیگم جمشید کے الفاظ درمیان میں رہ گئے، اس وقت
انہیں زوردار چکر آیا اور وہ سیٹ سے نیچے گر پڑیں۔ فرزانہ بوکھلا کر انہیں
اٹھانے کے لیے جھکی اور خود بھی گر گئی۔ چند سیکنڈ دونوں مکمل طور پر بے ہوش
ہوگئیں۔ ان کے گرنے کی آواز سن کر ڈرائیور کے ساتھی نے کہا:

'' ابھی گیس جاری رکھو۔ یہ لوگ بہت چالاک ہیں۔ ہوسکتا ہے۔ یہ
لڑکی جان بوجھ کر بے ہوش ہوئی ہو۔''

'' اچھی بات ہے، تم فکر نہ کرو، ہم ان کی کوئی چالاکی چلنے نہیں دیں
گے۔'' ڈرائیور بولا۔

اس کے بعد چند منٹ تک سوراخ سے گیس نکلتی رہی، پھر ڈرائیور
نے سوراخ بند کرتے ہوئے کہا:

'' اب مجھے سو فی صد یقین ہے کہ دونوں بے ہوش ہو چکی ہیں۔ اگر
اور گیس جاری رکھی تو خطرہ ہے کہ کہیں مر ہی نہ جائیں۔ ہمیں ان کی زندگی اور
موت سے تو کوئی سروکار نہیں، لیکن باس کو نہ جانے کیا کام ان سے لینا ہے
لہٰذا زندہ حالت میں ہی پیش کرنے کا حکم ملا ہے۔''

'' ٹھیک ہے۔'' دوسرا بولا۔

وین تقریباً آدھ گھنٹے تک چلتی رہی، پھر ایک جگہ رک گئی۔ دونوں
نیچے اترے۔ پچھلا دروازہ کھولا اور ان دونوں کو گھسیٹ کر باہر نکال لائے۔

ابھی تک بالکل بے ہوش تھیں، انہوں نے دونوں کو خوب ہلا کر دیکھا۔

'' یار کہیں یہ مر ہی تو نہیں گئیں۔'' ڈرائیور نے بوکھلا کر کہا۔ دوسرے
نے باری باری ان کی نبض دیکھی اور پھر بولا:

'' نہیں، دونوں کی نبض چل رہی ہے۔ میں ابھی انہیں دوسری دوا
سنگھاتا ہوں، کیونکہ اب انہیں ہوش میں آنا چاہیے۔'' دوسرے نے کہا اور
جیب سے ایک دوا کی ایک شیشی نکال کر انہیں سنگھائی۔ دونوں کے جسموں میں
حرکت پیدا ہوئی۔ چند سیکنڈ تک ہلتی جلتی رہیں پھر پہلے فرزانہ نے اور پھر بیگم
جمشید نے آنکھیں کھول دیں۔ انہوں نے دیکھا، وہ ایک بہت بڑے گیراج
میں کھڑی تھیں۔ اس میں وہ وین بھی موجود تھی، جس پر انہیں لایا گیا تھا۔ اس
کے علاوہ چند گاڑیاں موجود تھیں۔

'' اپنے پیروں پر کھڑی ہو جاؤ، تاکہ تمہیں اندر لے جایا جا سکے۔''
ڈرائیور بولا۔

'' تم لوگ کون ہو اور کیا چاہتے ہو۔'' فرزانہ نے پرسکون آواز میں
پوچھا۔

'' جلد تمہیں معلوم ہو جائے گا۔ تم ذرا چلنے کی تیاری کرو۔'' دوسرے
نے کہا۔

'' آخر چند منٹ بعد وہ چلنے کے قابل ہوگئیں۔ وہ انہیں لے کر
گیراج سے نکلے تو انہوں نے دیکھا کہ ان کے سامنے ایک طویل برآمدہ تھا،
اس برآمدے کے دونوں طرف کمرے تھے۔ عمارت بہت پرانی معلوم ہو رہی
تھی۔ کئی موڑ مڑنے کے بعد وہ دونوں ایک دروازے کے سامنے رک گئے۔
انہوں نے دستک دی تو اندر سے آواز آئی:

''کون ہے؟''

''ہم ان دونوں کو لے کر آگئے ہیں باس۔''

''بہت خوب، انہیں اندر لے آؤ۔'' اندر سے کہا گیا۔

ڈرائیور نے دروازہ دھکیلا اور اندر داخل ہو گیا۔ اس کے پیچھے وہ تینوں بھی اندر داخل ہوئے۔

☆☆☆

تازہ دم ساتھی

انسپکٹر جمشید ٹھیک پونے پانچ بجے دفتر سے نکل کر گھر کی طرف روانہ ہوئے اور پانچ بجنے میں چند سیکنڈ پہلے گھر کے دروازے پر پہنچے۔ انہوں نے گھنٹی کے بٹن پر انگلی رکھ دی، لیکن پھر انہیں ایک عجیب سا احساس ہوا۔ انہیں خیال گزرا، جیسے گھر میں کوئی نہ ہو۔ اب انہوں نے دروازے کو دھکیلا لیکن وہ تو بند تھا۔ انہوں نے جلدی سے اپنی جیب سے چابیاں نکالیں اور تالے کے سوراخ میں ایک چابی داخل کر کے گھمائی۔ تالا کھل گیا۔ انہوں نے دروازے کو دھکیلا اور اندر داخل ہوئے۔ پورا گھر سائیں سائیں کر رہا تھا۔ وہ دوڑتے ہوئے سب سے پہلے باورچی خانے میں گئے۔ چولہا جل رہا تھا، لیکن چائے کا پانی ابل ابل کر بھاپ میں تبدیل ہو چکا تھا اور اب برتن سرخ ہو چکا تھا۔ انہوں نے چولہا بند کر دیا۔ دماغ میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں اور پھر انہوں نے تمام کمرے دیکھ ڈالے۔ کسی کمرے میں بے ترتیبی کے آثار نظر نہ آئے۔ صحن میں بھی ہر چیز ترتیب سے موجود تھی؛ گویا انہیں زبردستی نہیں لے جایا گیا تھا، لیکن وہ جہاں بھی گئی تھیں، پریشانی کے عالم میں گئی تھیں، کیونکہ باورچی خانے میں چولہا جلتا چھوڑ گئی تھیں۔ اچانک انہیں کچھ خیال آیا، وہ دوڑ کر باہر نکلے اور بیگم شیرازی کے گھر کے دروازے کی گھنٹی بجائی۔ فوراً ہی دروازہ کھلا

اور بیگم شیرازی کی شکل نظر آئی۔

"کیا بات ہے بھائی جان، خیریت تو ہے؟"

"بیگم اور فرزانہ گھر میں نہیں ہیں۔ وہ آپ کو تو کچھ بتا کر نہیں گئیں۔"

"جی نہیں، لیکن تھوڑی دیر پہلے میں نے گلی میں ایک گاڑی رکنے کی آواز سنی تھی اور آپ کے دروازے پر کسی کے باتیں کرنے کی مدھم آواز سنی تھی۔"

"کیا آپ نے باہر نکل کر نہیں دیکھا تھا؟"

"جی نہیں، میں اس وقت ذرا نیند میں تھی۔" انہوں نے شرمسار لہجے میں کہا۔

"خیر، کوئی بات نہیں۔ میں انہیں تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ محمود اور فاروق بھی شام کی سیر سے واپس نہیں آئے۔ آنے والے ہی ہوں گے۔ آپ انہیں یہیں روک لیجیے گا۔"

"جی بہتر۔" انہوں نے کہا۔

انسپکٹر جمشید پھر گھر میں داخل ہوئے۔ انہوں نے باری باری تمام ہسپتالوں کو فون کیا۔ لیکن کہیں ان کا سراغ نہ مل سکا۔ آخر باہر نکلے۔ گھر کا دروازہ کھلا چھوڑا اور گاڑی میں بیٹھ کر ایک سمت میں چل پڑے۔ وہ جانتے تھے، یہ ان کا ایک احمقانہ قدم تھا۔ اتنے بڑے شہر میں بھلا، وہ انہیں کس طرح تلاش کر سکتے تھے، جب کہ ان کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم تھا۔

ایک سڑک کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری سڑک پر دور دور تک ہو آنے کے بعد ان کی مایوسی بڑھ گئی۔ گھر کے نمبر ڈائل کیے۔ جب کسی

نے ریسیور نہ اٹھایا تو بیگم شیرازی کے نمبر ملائے۔ سلسلہ ملتے ہی بولے:

"ہیلو بیگم شیرازی، محمود اور فاروق نہیں آئے اب تک؟"

"جی نہیں، میں خود بھی بہت پریشان ہوں۔"

"اور ان دونوں کی طرف سے بھی کوئی اطلاع نہیں ملی۔" انہوں نے فکرمندانہ لہجے میں کہا۔

"اچھا شکریہ۔" یہ کہہ کر انہوں نے سلسلہ کاٹ دیا اور اکرام کے نمبر ڈائل کیے۔ اسے جلدی جلدی حالات کی اطلاع دی اور پھر ریسیور رکھ کر گاڑی میں آ بیٹھے۔ چند سیکنڈ تک سوچ میں گم رہے۔ اچانک انہیں ایک خیال سوجھا۔ انہوں نے گاڑی کا رخ اس جنگل کی طرف کر دیا۔ جس کی طرف محمود اور فاروق سیر کے لیے جاتے تھے۔ اب ان کی جیپ گویا ہوا سے باتیں کر رہی تھی۔ ایک دو چوراہوں پر ٹریفک پولیس سیٹیاں بجاتی رہ گئی۔ ایک سارجنٹ نے موٹر سائیکل پر ان کا تعاقب کرنا چاہا، لیکن اتنی دیر میں ہی وہ نظروں سے اوجھل ہو چکے تھے اور سارجنٹ پیچ و تاب کھاتا رہ گیا۔ اس وقت اس کا دوسرا ساتھی اس جگہ موجود نہیں تھا۔ ورنہ وہ تعاقب ضرور کرتا۔

آندھی اور طوفان کی طرح جیپ چلاتے آخر وہ جنگل میں پہنچ گئے۔ جیپ انہوں نے سڑک سے نیچے اتار کر کھڑی کر دی اور خود پیدل ہی جنگل میں گھس گئے۔ وہ ادھر ادھر چکراتے پھرے لیکن محمود اور فاروق کا کوئی سراغ نہ ملا۔ اب انہوں نے تلاش کا دائرہ وسیع کر دیا اور آگے بڑھنے لگے۔ گھنے جنگل میں ایک جگہ انہیں چند سفید ذرات پڑے نظر آئے، وہ بے ساختہ ان ذرات پر جھک گئے۔

☆☆

"ارے ارے، تم لوگ تو سچ مچ لڑنے کے موڈ میں ہو۔" فاروق نے بوکھلا کر پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔ ساتھ ہی اس نے جیب میں ہاتھ ڈال دیا۔

"خبردار، جیب سے کوئی چیز نکالنے کی کوشش نہ کرنا، ورنہ ہم گولی بھی چلا سکتے ہیں۔"

"تو کیا تم مجھے رومال نکال کر ناک بھی صاف کرنے کی اجازت نہیں دو گے۔ بات دراصل یہ ہے کہ رات سے مجھ پر انفلوائنزا نے حملہ کر رکھا ہے۔ میں نے اس کا مقابلہ کرنے کی سرتوڑ کوشش کی، لیکن اسے پرے دھکیلنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ ویسے کیا آپ نے بھی کبھی سرتوڑ کوشش کی ہے۔ یہ بھی عجیب کوشش ہے۔ سر تو اس میں ٹوٹتا ہی نہیں۔" فاروق کہتا چلا گیا۔ ساتھ ہی رومال اس کے ہاتھ میں نظر آیا اور سامنے کھڑے دشمن مطمئن ہو گئے۔ فاروق نے رومال کو ایک جھٹکا دیا۔ اس نے ناک صاف کیا اور پھر جیب میں رکھنے کی کوشش میں اسے زمین پر گرا دیا۔

"ہم تمہاری ان تمام حرکات سے اچھی طرح واقف ہیں۔ یہ رومال اٹھا کر جیب میں رکھ لو۔" ان میں سے ایک نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

"بہت اچھا، شاید آپ کا باس ہم سے کچھ زیادہ ہی واقف ہے۔" فاروق نے جھینپ کر کہا۔

"ہاں، وہ تم سب کی رگ رگ سے واقف ہے۔"

"ارے باپ رے، اب تو ہمیں رگیں بدلنا پڑیں گی۔" فاروق بولا۔

"دیکھو، اگر تم شرافت سے ہمارے ساتھ چلے چلو تو بہت فائدے میں رہو گے۔ چوٹ ووٹ کھانے سے بچ جاؤ گے۔"

"اگر تم ہمیں یہ بتا دیتے کہ ساتھ جانے کا مقصد کیا ہے تو شاید ہم شرافت سے ہی چلے جاتے۔ لیکن ان حالات میں نہیں، ہم تم تینوں کو نچا دیں گے تگنی کا ناچ۔" فاروق نے کہا۔

"یہ تین ہیں، اگر چار ہوتے تو کیا چوگنی کا ناچ نچاتے۔" محمود نے ہنس کر کہا۔

"پتا نہیں، یہ میں اس وقت سوچتا، جب یہ چار ہوتے اس وقت یہ بات میں کسی صورت میں نہیں سوچ سکتا۔"

"چلو چھوڑو، نہ سوچو، آؤ تگنی کا ناچ شروع کریں۔" یہ کہتے ہی انہوں نے دائیں بائیں چھلانگیں لگا دیں اور بھاگتے چلے گئے۔ تین میں سے ایک فاروق کے پیچھے اور دو محمود کے پیچھے دوڑ پڑے۔ یہ دیکھ کر محمود نے بھنا کر کہا:

"یہ ناانصافی ہے، میرے پیچھے دو اور اس کے پیچھے ایک۔"

"ہاں، واقعی۔ تمہیں تو چاہیے کہ ڈیڑھ میرے پیچھے، ڈیڑھ اس کے پیچھے دوڑو۔" فاروق نے بھاگتے ہوئے کہا۔

"تم بھاگ کر کہیں نہیں جا سکو گے۔ آج کے دن تم ہمارے ہتھے ضرور چڑھو گے۔"

"کیوں، کیا کسی نجومی نے بتایا تھا۔" فاروق بولا۔

"ہمارے باس نے بتایا تھا۔ یہ منصوبہ بندی اسی کی کی ہوئی ہے۔ اس نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ تم لوگ ہمیں تگنی کا ناچ نچانے کی کوشش بھی کرو گے، لہٰذا اس نے اس کا بھی توڑ بتا دیا تھا۔"

"کیا مطلب؟" محمود چونک اٹھا۔

دونوں دائرے کی صورت میں دوڑ رہے تھے۔ اس لیے اس جگہ سے دور نہیں گئے تھے۔

''مطلب یہ کہ تم کتنا بھی دوڑ لو۔ آخر کو ہمارے ساتھ جانے پر مجبور ہو جاؤ گے۔''

''آخر کیسے، ہم دونوں تم تینوں سے پہلے تو ہرگز نہیں تھکیں گے۔'' محمود نے بھنا کر کہا۔

''ہاں، ہم جانتے ہیں۔ لیکن جب ہم تینوں تھک جائیں گے تو ہمارے تین تازہ دم ساتھی تمہارے پیچھے دوڑنا شروع کر دیں گے۔''

''اور تمہارے تازہ دم ساتھی کہاں ہیں؟''

''درختوں پر۔'' ہنس کر کہا گیا۔

محمود اور فاروق کی سٹی گم ہو گئی، کیونکہ ان حالات میں تو واقعی ان کی ہی شکست ہو سکتی تھی۔ تاہم انہوں نے ہمت نہ ہاری اور بدستور دوڑتے رہے، پھر محمود نے بلند آواز میں کہا۔

''بھئی فاروق ان کی اس ترکیب کا توڑ یہی ہے کہ تگنی کا ناچ خط مستقیم میں ہو۔''

''بالکل ٹھیک، میں بھی یہی کہنے والا تھا۔'' فاروق نے خوش ہو کر کہا اور سیدھا دوڑنے لگا۔ محمود نے بھی یہی کیا۔ اب دونوں ساتھ ساتھ دوڑ رہے تھے اور وہ تینوں بدستور ان کے پیچھے تھے۔

''تم اس ترکیب پر عمل کر کے بھی نہیں بچ سکو گے۔''

''کیوں؟''

''کیونکہ ہمارے آدمی درختوں پر دائرے کی صورت میں نہیں، خط

مستقیم کی صورت میں بھی ہیں۔'' ان میں سے ایک نے ہنس کر کہا۔

''دھت تیرے کی۔'' محمود جھلا اٹھا۔

''کاش، اس وقت فرزانہ ہمارے ساتھ ہوتی۔''

''تم شاید اپنی بہن کا ذکر کر رہے ہو۔'' پیچھے سے کہا گیا۔

''ہاں، وہ ترکیبیں بتانے میں بہت ماہر ہے۔ اس وقت وہ کوئی ایسی ترکیب فوری طور پر بتا سکتی تھی کہ سانپ بھی مر جائے، لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔'' اس نے کہا۔

''ہمارے خیال میں تو تمہارا یہ خیال غلط ہے۔'' ایک بولا۔

''تمہارے خیال میں تو نہ جانے کیا کچھ غلط ہو سکتا ہے۔'' محمود نے منہ بنایا۔

''یہ ہم اس لیے کہہ رہے ہیں کہ عین اس وقت باس کا پروگرام ان کے ساتھ شروع ہو چکا ہوگا۔''

''کیا مطلب؟'' دونوں زور سے چونکے۔

اس کے ساتھ ہی ایک شاخ محمود کے سر پر پڑی۔ یہ حرکت درخت پر موجود ایک آدمی نے کی تھی۔ اس درخت کی شاخیں بہت نیچی تھیں۔ اس نے ان میں ایک پکڑ کر موقع ملتے ہی محمود کے سر سے ٹکرا دی۔ شاخ کافی موٹی بھی تھی اور محمود بے خبر، لہٰذا زور سے لگی۔ وہ لڑکھڑا گیا اور سنبھلنے کی کوشش کرتے ہوئے زمین پر آ رہا۔

''یار فاروق، شاید ان کا ہی خیال درست ہے۔ یہ لوگ پوری تیاری کر کے گھر سے نکلے ہیں۔'' اس نے دونوں ہاتھوں میں سر تھامتے ہوئے کہا۔

''نا امیدی کی باتیں نہ کرو، سر کو ایک جھٹکا دو اور اٹھ کر کھڑے ہو جاؤ۔''

''مجھے بہت زور سے چکر آ رہا ہے۔'' محمود بولا۔

''اچھا تو پھر اللہ مالک ہے، میں تو خود کو ان کے حوالے نہیں کروں گا۔ یہ بھی کیا یاد کریں گے کہ کسی رئیس سے ملاقات ہوئی تھی۔'' فاروق محمود کے گرنے کے بعد پھر دائرے کی صورت میں دوڑنے لگا تھا تاکہ اس سے دور نہ رہے۔ اچانک ایک جال اس کے سر پر گرا اور وہ اس میں الجھ کر اوندھے منہ گرا۔

''لاحول ولا قوۃ، یہ لوگ تو پورے ساز و سامان کے ساتھ آئے ہیں۔'' اس نے جھلا کر کہا۔

''چلو بھئی انہیں کامیاب ہو جانے دو، آج کے دن۔ دیکھا جائے گا، جو ہوگا۔'' محمود اداس انداز میں مسکرایا۔

''مجھے تو امی جان اور فرزانہ کی فکر کھائے جا رہی ہے۔ نہ جانے ان لوگوں نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا ہوگا۔''

جال تنگ ہوتا چلا گیا اور فاروق اس میں الجھ کر رہ گیا۔ اسی وقت ایک جال محمود کے اوپر بھی آ کر گرا اور اسے بھی جکڑ لیا گیا۔

''دیکھو، تم ہم سے جانوروں ایسا سلوک کر رہے ہو۔ اس طرح تو شکاری لوگ جانوروں کا شکار کرتے ہیں۔ باز آ جاؤ، ورنہ تمہارا انجام بھی بہت بھیانک ہوگا۔'' فاروق نے انہیں دھمکی دی۔

''ہم نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ شرافت سے ہمارے ساتھ چلو، تم مانے ہی نہیں۔'' ان میں سے ایک بولا۔

اور پھر دھم دھم کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ انہوں نے دیکھا، تقریباً دس آدمی درختوں پر سے کودے تھے۔

''تو یہ صرف ہم دو کے لیے تم اتنے آدمی آئے تھے۔''

''باس کا خیال تھا کہ تم دونوں کو قابو کرنے کے لیے زیادہ ہی آدمیوں کی ضرورت ہے۔ تم دونوں اسے زندہ سلامت حالت میں درکار ہو، ورنہ تو تمہارے لیے صرف ایک آدمی اور ایک پستول ہی کافی ہوتا۔''

''تو کیا یہ درختوں اور جالوں والی منصوبہ بندی بھی تمہارے باس نے ہی کی تھی؟'' محمود کے لہجے میں حیرت تھی۔

''ہاں، ہم لوگ تو صرف اس کی ہدایات پر عمل کرتے ہیں۔ منصوبے کی تمام تفصیلات وہ خود طے کرنے کا عادی ہے۔''

''وہ کون ہے، اور تم کب سے اس کے ساتھ کام کر رہے ہو۔''

''پتا نہیں، ایسے سوالات کے جوابات کی امید رکھنا بے کار ہے اور اب ہم اس کے منصوبے کی ایک اور ہدایت پر عمل کرنے لگے ہیں۔ تمہاری گرفتاری کی حد تک یہ آخری ہدایت ہے۔''

یہ کہہ کر ان میں سے ایک ان کی طرف بڑھا۔ اس کا ایک ہاتھ جیب میں تھا:

''کیا ارادہ ہے بھئی، پہلے بتا تو دو۔ محمود نے پریشان ہو کر کہا۔

''بس ذرا تمہیں بے ہوش کریں گے۔'' اس نے ہنس کر کہا۔

''ارے بس اتنی سی بات، یہ کون سی مشکل بات ہے، لو ہم خود ہی بے ہوش ہوئے جاتے ہیں۔'' یہ کہہ کر فاروق نے آنکھیں بند کر لیں اور بند کرتے وقت بولا:

''محمود، تم بھی بے ہوش ہو جاؤ۔''

''اچھا۔'' اس نے کہا اور آنکھیں بند کر لیں۔

اسی وقت اس کی ناک سے ایک رومال آ لگا، اور اس کا ذہن تاریکیوں میں ڈوب گیا۔ فاروق نے کن انکھیوں سے اسے بے ہوش ہوتے دیکھا اور پھر رومال کے ناک سے آ لگنے کا انتظار کرنے لگا۔ جوں ہی رومال لگا، اس نے اپنا سانس روک لیا۔ اس نے سوچا تھا کہ شاید رومال جلد ہی ہٹا لیا جائے گا اور اس ترکیب پر عمل کرنے سے وہ بے ہوش ہونے سے بچ جائے گا لیکن کافی دیر تک نہ ہٹا اور اسے سانس لینا ہی پڑا۔ دوسرے ہی لمحے اس کا ذہن بھی سوتا چلا گیا۔

پہلے محمود کی آنکھ کھلی۔ اس نے فاروق کو اپنے ساتھ لیٹا ہوا پایا۔ جلدی سے اٹھ کر اس نے دونوں ہاتھوں سے اسے جھنجھوڑ ڈالا۔ وہ بھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور پھر اس کے منہ سے نکلا۔

''ہائیں، یہ ہم کہاں ہیں؟ ہم کب سوئے؟ کیا ہم نے شام کی چائے پی لی تھی۔ رات کا کھانا کھا لیا تھا، ارے یہ ہمارا کمرہ تو نہیں ہے۔''

''ہوش میں آؤ فاروق کیا تم جنگل میں تگنی کا ناچ بھول گئے؟''

''اوہ، تو..... تو ہم ان لوگوں کی قید میں ہیں؟'' اس نے بوکھلا کر کہا۔

''بالکل یہی بات ہے، اور میں امی جان اور فرزانہ کے لیے بہت فکر مند ہوں۔''

''تم فکر نہ کرو، میں بھی تم جتنا ہی فکر مند ہوں۔''

''دھت تیرے کی۔ یہ تم کیا اوٹ پٹانگ باتیں کر رہے ہو۔ تمہارا

دماغ تو ٹھیک ہے نا۔''

''ارے دماغ، ٹھہرو، اس سے پوچھ کر بتاتا ہوں۔'' اس نے پیشانی مسلتے ہوئے کہا۔

اسی وقت کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔

☆☆☆

سفید ویگن

بیگم جمشید اور فرزانہ ان کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئیں۔ انہوں نے دیکھا، اندر ایک گوریلا نما آدمی ایک آرام کرسی میں لیٹا ہوا تھا۔ اس کا رنگ بالکل سیاہ تھا۔ آنکھیں بہت موٹی اور باہر کو نکلی ہوئی تھیں۔ ان میں خوف ناک چمک تھی۔ ہاتھوں اور بازوؤں پر بہت گھنے سیاہ بال تھے۔ جنہوں نے اس کی جلد کو ڈھک لیا تھا۔

''آؤ، آؤ، معزز مہمانوں، خوش آمدید۔ معزز ہی نہیں، بہت قیمتی بھی۔ تمہارے بل پر مجھے پانچ لاکھ روپے کا کام ملا ہے۔ کام پانچ لاکھ روپے کا ہے، اور لگیں گے اس میں شاید ایک یا دو دن۔ تمہارے یہاں آنے کے بعد میرا کام آسان ہو گیا ہے۔''

''ہمارے بل پر، لیکن ہم میں بل چھل کہاں ہیں؟'' فرزانہ حیران ہو کر بولی۔

''ہو ہو۔'' وہ بھدے انداز میں ہنسا: ''تم مذاق کرنا بھی جانتی ہو۔ میں نے تو سنا تھا، یہ کام تمہارے بھائی فاروق نے اپنے ذمے لے رکھا ہے۔''

''معلوم ہوتا ہے، تم ہمارے بارے میں کافی معلومات رکھتے ہو۔'' فرزانہ جلے کٹے لہجے میں بولی۔

''کافی نہیں، بہت زیادہ کہو۔ وہ کون سی بات ہے جو میں نہیں جانتا۔ مجھے تو یہ تک معلوم ہے کہ آج کل تمہارے دونوں بھائی شام کے وقت جنگل کی سیر کو بھی نکلتے ہیں۔'' اس نے وحشیانہ انداز میں مسکرا کر کہا۔

''کیا مطلب؟'' فرزانہ چونک اٹھی۔

''مطلب یہ کہ ابھی تھوڑی دیر تک وہ بھی یہاں ہوں گے۔''

''اوہ، آخر تم چاہتے کیا ہو؟''

''تم دونوں سے تو کچھ بھی نہیں چاہتا۔ بس تم تو یہاں بطور مہمان رہو گی۔ کام تو مجھے تمہارے دونوں بھائیوں سے لینا ہے۔'' اس نے پراسرار انداز میں کہا۔

''آخر وہ کام کیا ہے؟''

''بس ایسا ہی کام ہے کہ اگر میں تم دونوں کو یہاں پکڑ کر نہ بلواتا تو محمود اور فاروق بھی اس کام کو کرنے کے لیے تیار نہ ہوتے۔''

''اوہ۔'' فرزانہ اور بیگم جمشید کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

''اب رہ گئے انسپکٹر جمشید، تو انہیں اس معاملے سے الگ ہی رکھا جائے گا، کیونکہ وہ ملک اور قوم کے معاملے میں ذرا جذباتی سے واقع ہوئے ہیں۔ جوش میں آ کر کہہ دیں گے، میری بیوی اور بچی کی جان جاتی ہے تو جائے، یہ کام میں نہیں کروں گا۔''

''تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ محمود اور فاروق یہ نہیں کہہ دیں گے کہ ہماری امی اور بہن کی جان جاتی ہے تو جائے، ہم یہ کام نہیں کریں گے۔'' بیگم جمشید بولیں۔

''وہ، ابھی بچے ہیں۔ ان کی سوچ اتنی پختہ نہیں ہو سکتی۔ وہ میرے

حکم کی تعمیل کرنے پر مجبور ہوں گے۔''

''تب تو ہمارے بارے میں تم کچھ بھی نہیں جانتے، ہم وہ ہیں، جو جان تو دے دیا کرتے ہیں، اپنے ملک پر کوئی آنچ نہیں آنے دیا کرتے۔'' بیگم جمشید اکڑ کر بولیں۔

''یہ تو وقت ہی بتائے گا۔''

''تو پھر جب وقت تمہیں بتا دے، ہمیں بھی بتا دینا۔''

''ہاں ضرور، اب تم اس عمارت میں مہمان رہو گی۔ لے جاؤ بھئی انہیں۔'' اس نے لاپروائی سے کندھے اچکائے۔

''تم نے اپنا نام نہیں بتایا۔'' فرزانہ نے جلدی سے پوچھا۔

''مجھے لوگ باس کے نام سے پکارتے ہیں۔'' وہ مسکرایا۔

''خیر دیکھا جائے گا۔'' فرزانہ نے کندھے اچکائے۔

انہیں ساتھ لانے والے دونوں آدمی ان کی طرف بڑھے۔

''چلیے آپ کو آپ کا کمرہ دکھا دیں۔''

ایک بار پھر انہیں کئی برآمدوں سے گزرنا پڑا۔ آخر ایک کمرے کے دروازے پر وہ رک گئے۔ فرزانہ فرار کے بارے میں مسلسل سوچ رہی تھی۔ ابھی تک اسے برآمدوں میں ان دونوں آدمیوں کے علاوہ کوئی بھی نظر نہیں آیا تھا۔ عمارت حد درجے طویل و عریض تھی، یوں لگتا تھا جیسے کوئی محل ہو، لہٰذا یہ بات بہت عجیب تھی کہ اس عمارت میں باس اور ان دونوں کے علاوہ کوئی نہ ہو۔ ضرور ان بے شمار کمروں میں باس کے آدمی موجود تھے، جو اس کا ایک اشارا ملتے ہی کمروں سے نکل پڑتے۔ کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے ان میں سے ایک نے کہا:

''کمرے کی دیواریں بہت اونچی ہیں۔ روشندان تک کوئی چیز تمہیں نہیں پہنچا سکتی۔ ویسے بھی روشن دان میں سلاخیں لگی ہیں۔ کھڑکیوں میں بھی سلاخیں لگی ہیں۔ یوں بھی کھڑکیاں صرف برآمدے میں کھلتی ہیں، روشندان البتہ باہر کی طرف ہے، لیکن اس تک اول تو تم پہنچ ہی نہیں سکتیں۔ اگر کسی طرح پہنچ بھی جاؤ تو ان سلاخوں کو نہیں توڑ سکتیں اور اگر توڑ بھی لو تو دوسری طرف چھلانگ نہیں لگا سکتیں۔ چھلانگ لگا بھی دو تو دوسری طرف گر کر تمہارا جسم گوشت اور ہڈیوں کا ایک ڈھیر ہی نظر آئے گا اور تم کسی نہ کسی طرح گوشت اور ہڈیوں میں تبدیل ہونے سے بچ بھی جاؤ تو اس روشندان کے نیچے دو خونخوار کتے زنجیروں سے بندھے ہیں۔ یہ محل شہر سے الگ تھلگ مقام پر واقع ہے۔ وہ کتے تمہیں نہیں چھوڑیں گے۔ اگر تم کسی طرح ان کتوں سے بچ بھی جاؤ تو بھی نہیں بھاگ سکو گی، کیونکہ اس وقت تک اس محل کی فوج نیچے پہنچ چکی ہو گی اور ناکہ بندی کر چکی ہو گی۔ کہنے کا مطلب یہ کہ اگر تمہارے دماغ میں فرار ہونے کا خیال بھی آئے تو اسے ذہن سے نکال پھینکنے میں ہی تمہاری بہتری ہے۔ صورت حال اس وقت پوری طرح ہمارے کنٹرول میں ہے۔ کیا سمجھیں۔''

''یہی کہ تم چاہتے ہو، ہم یہاں سے فرار ہو کر کہیں تمہارا کھیل نہ بگاڑ دیں۔'' فرزانہ مسکرائی۔

''چلو یوں ہی سہی۔'' ان الفاظ کے ساتھ ہی کمرے کا دروازہ بند کر دیا گیا۔ فوراً ہی فرزانہ کمرے کا جائزہ لینے میں جٹ گئی۔

''کیا کرنے لگیں؟''

''یہ دیکھ رہی ہوں، یہاں سے فرار کا کوئی راستہ ممکن ہے یا نہیں۔''

''اس نے ساری تفصیل تمہیں بتا تو دی۔'' وہ بولیں۔

''انہوں نے اپنے حساب سے ہمارے فرار کے راستے بند کیے ہیں
امی جان، میں اپنے حساب سے جائزہ لوں گی۔ سب سے پہلے تو میں کسی نہ کسی
طرح اس روشن دان سے باہر جھانک کر دیکھنا چاہتی ہوں۔''

''کیوں اس سے کیا ہوگا۔''

''اس سے یہ ہوگا کہ مجھے اس محل سے باہر کا علاقہ کسی حد تک نظر
آجائے گا۔ بعد میں ہر چیز ہمارے کام آسکتی ہے۔''

''تمہاری تم ہی جانو، میں تو ایک بات جانتی ہوں اور وہ یہ کہ
تمہارے ابا جان ہماری تلاش میں نکل چکے ہوں گے۔ اور جلد یہاں تک پہنچ
جائیں گے۔''

''لیکن امی جان، اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ
جائیں۔'' فرزانہ بولی اور کمرے میں موجود بھاری پلنگ کو اٹھانے کی کوشش
کرنے لگی۔

''اوہو، بہت وزنی ہے امی جان، ذرا میری مدد کریں۔''

''اچھا۔'' انہوں نے کہا اور فرزانہ کے ساتھ مل کر پلنگ روشن دان
کے عین نیچے دیوار سے لگا کر کھڑا کر دیا۔ اس کی لمبائی دیکھ کر فرزان نے
مایوسانہ انداز میں سر ہلایا۔

''یہ تو بہت نیچا ہے۔ اب کیا کریں امی جان؟''

''بھلا میں کیا بتا سکتی ہوں۔ میں محمود یا فاروق نہیں ہوں۔'' انہوں
نے قدرے جھلا کر کہا اور فرزانہ کو ہنسی آگئی۔

''اچھا تو ہم ایسا کرتے ہیں کہ دوسرے پلنگ کے اوپر اسے رکھ
دیتے ہیں۔ اس کے بعد میں پلنگ پر چڑھ کر دیکھوں گی۔''

''میرے خیال میں تو تم پھر بھی روشندان تک نہیں پہنچ سکو گی۔''

''امی جان، کوشش کر دیکھنے میں کیا حرج ہے۔ یوں بھی ہمیں وقت تو
گزارنا ہی ہے۔ آیئے پہلے اس پلنگ کو بچھا دیں اور پھر اس پر دوسرا پلنگ کھڑا
کر دیں، لیکن نہیں پہلے ہمیں اس پلنگ کی رسی کھول لینی چاہیے۔ شاید اس سے
بھی کوئی کام لیا جا سکے۔'' اس نے چونک کر کہا اور جلدی جلدی اسے کھولنے لگی
۔ بیگم جمشید اسے حیرت بھرے انداز میں دیکھ رہی تھیں۔ آخر ساری رسی پلنگ
سے الگ ہو گئی۔ اب انہوں نے اس پلنگ کے اوپر دوسرا پلنگ کھڑا کیا، پھر
فرزانہ اس پر چڑھتی چلی گئی۔ اس کے اوپر والے حصے پر پاؤں جما کر جب اس
نے ہاتھ روشندان تک لے جانا چاہے تو روشن دان ابھی چار فٹ دور تھا۔ آخر
اس نے واپس آتے ہوئے کہا:

''نہیں امی جان، اس ترکیب سے کام نہیں چلے گا، میری یہ ترکیب
فیل ہو گئی۔''

''بھئی میں کہتی ہوں، اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔'' بیگم جمشید
بولیں۔

''امی جان، ہمیں ہر طرح کے حالات کے لیے تیار رہنا چاہیے۔
ضروری نہیں کہ ابا جان یہاں پہنچ ہی جائیں۔'' فرزانہ بولی اور بیگم جمشید اسے
تکتے رہ گئیں۔ فرزانہ اب پھر کمرے کا جائزہ لے رہی تھی۔ اچانک اس کی نظر
چھت کے بیچوں بیچ لوہے کے ایک کنڈے پر پڑی۔ ایسے کنڈے جھاڑ فانوس یا
پنکھے لٹکانے کے لیے لگائے جاتے ہیں۔ اس نے کنڈے اور روشندان کا فاصلہ
ناپا اور غور کرنے کے لیے فرش پر اکڑوں بیٹھ گئی۔

''کیا سوچ رہی ہو؟''

''سوچ رہی ہوں، چھت میں ایک کنڈا موجود ہے اور ہمارے پاس ایک رسی۔ ان دونوں کی مدد سے میں روشن دان تک کس طرح پہنچ سکتی ہوں۔''

''کسی طرح بھی نہیں، یہ ہو ہی نہیں سکتا۔'' انہوں نے پریقین لہجے میں کہا۔

''امی جان، اس وقت اگر محمود اور فاروق میرے ساتھ ہوتے تو یہ الفاظ بھی نہ کہتے، بلکہ خود بھی سوچنے بیٹھ جاتے۔'' فرزانہ نے نرم آواز میں کہا۔

''اب میں کیا کروں ان معاملات میں میرا ذہن نہیں چلتا۔''

''تو پھر یہ دیکھتی رہیے کہ میں کیا کرتی ہوں۔'' اس نے کہا اور پھر سوچ میں گم ہوگئی۔ پھر سوچنے کے انداز میں ہی اس نے کہا:

''سنیے امی جان، آپ لوہے کے اس کنڈے کو دیکھ رہی ہیں نا۔ اور اس رسی کو بھی۔ میں ان......'' اس کے الفاظ درمیان میں رہ گئے۔ اسی وقت دروازہ کھلنے کی آواز آئی تھی۔

☆☆

انہوں نے دیکھا، سفید سفید ذرات پاؤڈر کے تھے۔ وہ فاروق کی اس عادت سے بخوبی واقف تھے۔ وہ ہمیشہ اپنا رومال کی اندرونی تہہ میں پاؤڈر چھڑک کر رکھتا تھا۔ اور اکثر رومال کو سونگھتا رہتا تھا۔ اس کی یہ حرکت دو ایک مرتبہ پہلے بھی ان کے کام آچکی تھی۔ انہوں نے ادھر ادھر دیکھا، لیکن رومال کہیں نظر نہ آیا شاید اسے رومال پھینکنے کی مہلت نہیں دی گئی تھی ورنہ وہ معاملے کو یقینی بنانے کے لیے رومال بھی یہیں کہیں ضرور چھوڑ دیتا بلکہ اس طرح

چھوڑتا کہ ان کے جانے کی سمت کا اندازہ ہو جاتا۔ انہوں نے آس پاس کا تمام علاقہ دیکھ ڈالا، لیکن یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کس سمت میں گئے یا لے جائے گئے ہیں۔ آخر تھک ہار کر وہ واپس پلٹے اور شہر میں داخل ہوتے ہی اکرام کو فون کیا۔ اس سے حالات معلوم کیے۔ ابھی تک وہ بھی ان لوگوں کا کوئی سراغ نہیں لگا سکا تھا۔ پھر انہوں نے اپنے گھر فون کیا، وہاں سے کسی نے ریسیور نہ اٹھایا تو بیگم شیرازی کو فون کیا۔ ان کی طرف سے بھی مایوس کن جواب ملا۔ اب تو وہ بہت چکرائے۔ تینوں بچے اور بیگم غائب تھے اور اس طرح غائب تھے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ ایک ذرا سا سرا اگر ملا تھا تو صرف اتنا کہ فاروق نے رومال جھٹک کر پاؤڈر کے ذرات گرا دیے تھے۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ ان کے ساتھ کوئی گڑبڑ ضرور ہوئی ہے۔ رہیں بیگم جمشید اور فرزانہ، ان کے ساتھ بھلا کیا ہوا ہوگا۔ کیا فرزانہ نے کوئی سراغ نہیں چھوڑا ہوگا۔ وہ چونک اٹھے۔ اس نظریے سے انہوں نے ابھی گھر کا جائزہ نہیں لیا تھا۔ انہوں نے جیپ کا رخ گھر کی طرف موڑ دیا، گھر پہنچے ہی تھے کہ بیگم شیرازی دروازہ کھول کر باہر آگئیں۔

''کچھ پتا چلا بھائی جان۔''

''ابھی تک نہیں۔ آپ کو تو کوئی فون نہیں ملا۔''

''جی نہیں۔''

''کمال ہے۔ اگر اغوا کرنے والوں کا مقصد کوئی بڑی رقم حاصل کرنا ہے تو اب تک تو فون ضرور آجانا چاہیے تھا۔ ضرور یہ کوئی اور معاملہ ہے۔'' انہوں نے کہا اور گھر میں داخل ہوگئے۔ بیگم شیرازی باہر ہی کھڑی رہ گئیں۔ اندر آکر انہوں نے بغور ایک ایک چیز کا جائزہ لیا، لیکن کوئی سراغ

نہیں ملا۔ اس کا مطلب صرف یہ تھا کہ ان دونوں کو غلط فہمی میں مبتلا رکھ کر اغوا کیا گیا تھا۔ شاید کسی ایکسیڈنٹ کی خبر سنائی ہوگی۔ انہیں یاد آیا، بیگم شیرازی نے ایک گاڑی کے رکنے کی آواز سنی تھی، وہ پھر باہر نکل آئے۔ بیگم شیرازی ابھی تک اپنی جگہ فکرمند سی کھڑی تھیں۔

''آپ نے اس گاڑی کو دیکھا تو نہیں تھا؟''

''جی نہیں، صرف آواز سنی تھی۔''

''کیا آپ اندازہ لگا سکتی ہیں وہ کس گاڑی کی آواز تھی۔''

''جہاں تک میرا خیال ہے، کسی ویگن کی آواز تھی۔''

یہ سنتے ہی انسپکٹر جمشید نے اپنے پڑوسیوں کے دروازوں پر دستک دینے کا سلسلہ شروع کیا۔ انہوں نے ہر ایک سے گلی میں رکنے والی ویگن کے بارے میں پوچھا۔ آخر گلی کے سرے والے گھر کے مالک نے انہیں بتایا۔

''میں نے ایک سفید رنگ کی ویگن گلی میں داخل ہوتے دیکھا اور پھر آپ کے دروازے پر رکتے دیکھی تھی اور یہ خیال کیا تھا کہ ہسپتال سے کوئی رپورٹ آپ کو دینے کے لیے آئی ہوگی، کیونکہ عام طور پر ایسا ہوتا رہتا ہے۔ اس لیے میں نے کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ تھی وہ کسی ہسپتال کی ویگن ہی۔ اس پر سرخ نشان بھی موجود تھا اور اس کی چھت پر نیلا اشارا بھی لگا تھا۔''

''اوہ۔'' ان کے منہ سے نکلا: ''تو میرا خیال درست ہی تھا۔ انہیں ایکسیڈنٹ کی خبر سنا کر اغوا کیا گیا ہے۔''

''جی کیا مطلب؟'' پڑوسی چونکا۔

''جی شکریہ، کچھ نہیں۔ میرے بچوں کو اس ویگن کے ذریعے اغوا کیا گیا ہے۔'' انہوں نے کہا۔

''اوہ۔'' پڑوسی دھک سے رہ گیا۔ اور وہ واپس لوٹے۔ انہوں نے اکرام کو فون پر اطلاع دی کہ بیگم اور فرزانہ کو ایک سفید رنگ کی ہسپتال ویگن کے ذریعے اغوا کیا گیا ہے، لہذا اس کی تلاش کا دائرہ وسیع کر دیا جائے۔ تمام پولیس اسٹیشنوں کو اطلاع دی جائے۔'' فون کرنے کے بعد وہ خود بھی شہر کی سڑکوں پر جیپ دوڑانے کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ اب وہ سڑکوں پر سفید رنگ کی ویگن کی تلاش میں نظریں دوڑا رہے تھے۔ اچانک وہ زور سے چونکے۔

☆☆☆

مشکل موڑ

محمود اور فاروق نے دیکھا، کمرے میں دو لمبے تڑنگے نوجوان کھڑے انہیں طنز بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ وہ بھی ان کی طرف دیکھنے لگے۔ آخر محمود نے بھنا کر کہا:

''ہمیں ان نظروں سے دیکھنے کی ایسی کیا خاص ضرورت ہو گئی دوستو۔''

''دیکھ رہے ہیں، یہ ہیں وہ، جن کا بہت شہرہ ہے۔''

''تم سے بھول ہوئی، ہم وہ نہیں، صرف محمود اور فاروق ہیں۔''

''چلو اٹھو، باس تم سے فوری طور پر ملنا چاہتا ہے۔''

''چلو، دیکھیں تو سہی۔ آخر وہ چاہتا کیا ہے۔'' محمود نے لاپروائی سے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ فاروق نے بھی اس کا ساتھ دیا، دونوں ان کے آگے چلتے کمرے سے باہر نکلے۔ انہوں نے دیکھا ایک محل نما عمارت میں تھے۔ ایک طویل برآمدہ طے کرتے اور ایک موڑ مڑنے کے بعد وہ ایک کمرے کے دروازے پر رک گئے۔ یہاں تک لانے والوں میں سے ایک نے دستک دی۔ ساتھ ہی وہ بولا:

''دونوں حاضر ہیں باس۔''

''انہیں اندر لے آؤ۔''

انہوں نے دروازہ دھکیلا اور اندر داخل ہو گئے۔ آرام کرسی میں انہیں ایک گوریلا نما آدمی لیٹا نظر آیا۔

''ہیلو کیوں بھئی، کیا حال ہے۔''

''اچھا ہے، آپ سنائیے۔'' فاروق خوش ہو کر بولا اور محمود کو ہنسی آ گئی۔

''تمہارا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔''

''آخر ہم دو بے چاروں کی آپ کو ایسی کیا ضرورت پڑ گئی۔''

''اگر ضرورت نہ پڑتی تو تمہیں یہاں لانے کے لیے اتنے پاپڑ کیوں بیلتا۔'' اس نے بھاری بھرکم آواز میں کہا۔

''ہائیں، تو آپ پاپڑ بھی بیلتے ہیں، کمال ہے۔'' فاروق نے فوراً کہا۔

''تمہارا یہ بھائی بہت بولتا ہے۔ اس کی زبان درازی کے قصے بھی میں نے بہت سن رکھے ہیں۔ لیکن اس وقت میں جو بات کرنا چاہتا ہوں۔ وہ بہت غور سے سننے کی ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ یہ پہلے اپنی زبان روک لے ورنہ حالات نازک ہیں اور ابھی تمہیں ان کی نزاکت کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں، اشارتاً یہ بتا دوں کہ تمہاری والدہ اور بہن فرزانہ اس وقت میرے قبضے میں ہیں۔''

''کیا؟'' ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

''ہاں، تمہیں ان دونوں کو دیکھنے کا موقع بھی دیا جائے گا تاکہ تم اس بات کو جھوٹ نہ خیال کرلو۔''

دونوں کی سٹی گم ہوگئی۔ ان کی آنکھیں اس گوریلے پر جم گئیں۔

''تم انہیں یہاں کیوں لائے ہو؟'' محمود سانپ کی طرح پھنکارا۔

''میں تم سے ایک کام لینا چاہتا ہوں۔ اگر انکار کرو گے تو ان دونوں کو زندہ نہیں دیکھ پاؤ گے۔'' باس ہنس کر بولا۔

''تم نے بہت اوچھا وار کیا ہے، تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔'' فاروق نے غرا کر کہا۔

''زیادہ تڑپنے اور تلملانے کی ضرورت نہیں۔ وہ دونوں بالکل خیریت سے ہیں۔ ان کے جسم پر ایک خراش بھی نہیں آئی۔ اس حالت میں وہ گھر پہنچ جائیں گی۔ بشرطیکہ تم میرا ایک کام کر دو۔''

''خیر، جلدی بتاؤ، کیا کام ہے۔ ہم اپنی والدہ اور بہن کو زیادہ دیر قید میں برداشت نہیں کر سکتے۔'' محمود نے برا سا منہ بنایا۔

''جو کام تمہارے ذمے لگایا جا رہا ہے، اس کی بھنک بھی تمہارے والد کے کانوں میں نہ پڑے، ورنہ تم یہ کام نہیں کر سکو گے اور نتیجہ یہ ہوگا کہ اپنی ماں اور بہن کو زندہ نہیں پا سکو گے۔'' اس نے پراسرار لہجے میں کہا۔

''کیا مطلب؟'' دونوں چونکے۔

''مطلب یہ کہ میں انسپکٹر جمشید کو اچھی طرح جانتا ہوں، جب اسے معلوم ہوگا کہ میں کیا چاہتا ہوں، تو وہ فوراً تم دونوں کو روک دے گا اور کہے گا، ملک اور قوم کے لیے اگر تمہاری بہن اور والدہ کی جانیں جاتی ہیں تو جائیں۔''

''اوہو، تو یہ ملک اور قوم کا معاملہ ہے۔'' محمود نے فکر مندانہ لہجے میں کہا۔

''ہاں، آج دو چیزوں میں سے تمہیں ایک چیز کا انتخاب کرنا ہے۔ ملک اور قوم کا مفاد یا اپنی والدہ اور بہن کی زندگی۔''

''معموں میں باتیں نہ کرو، صاف صاف کہو، کیا کہنا چاہتے ہو۔ ...یے تو ہم یہ سمجھتے ہیں کہ تم ہمیں انتہائی مشکل موڑ پر لے آئے ہو۔'' محمود کو ...پنی جسم سے جان نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔

''کام بہت آسان ہے۔ آئی جی صاحب ان دنوں ایک وفد کے ...ساتھ ملک سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ ان کی کوٹھی کے گرد بہت خاص قسم کا پہرہ ...ہے اور حفاظت کا انتظام ایسا ہے کہ اگر میں اپنے آدمیوں کے ذریعے وہ کام ...نا چاہوں تو کئی جانیں ضائع ہو جائیں گی اور کامیابی شاید پھر بھی نہ ہو، لہذا ...یں نے سوچا یہ ہے کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ آئی جی ...صاحب کی تجوری میں گھونگھے کی شکل کی ایک ڈبیا موجود ہے۔ مجھے اس ڈبیا ...کی ضرورت ہے۔''

''گھونگھے کی شکل کی ڈبیا۔'' ان کے منہ سے حیرت زدہ انداز میں ...۔

''ہاں، تجوری کے اندر ہی کہیں حفاظت سے رکھی ہوئی مل جائے ...گی۔ اس کا رنگ سرخ ہے۔''

''لیکن اس ڈبیا میں ہے کیا؟''

''یہ تمہیں نہیں بتایا جا سکتا۔ اس کے متعلق صرف آئی جی صاحب کو ...معلوم ہے یا پھر مجھے، تمہارے لیے یہ کام بہت آسان ہے۔ یوں سمجھو کہ چٹکی ...بجاتے میں کر لو گے۔''

''وہ کیسے، جب کہ تم خود اس بات کا اقرار کر چکے ہو کہ کوٹھی کی

خاص حفاظت کا بند بست کیا گیا ہے۔''

''ہاں، لیکن تمہیں اس گھر کا ہر فرد جانتا ہے۔ تم کوئی ترکیب لڑا کر ان کی موجودگی میں تجوری کھلوا سکتے ہو اور وہ ڈبیا نکال سکتے ہو۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوگی۔''

''لیکن بعد میں جب آئی جی صاحب آ کر تجوری دیکھیں گے، اس وقت تو انہیں خبر ہو ہی جائے گی۔'' فاروق بولا۔

''ہوتی رہے۔ اس وقت ڈبیا بہت دور جا چکی ہوگی۔''

''لیکن آئی جی صاحب کے گھر کے افراد انہیں بتا دیں گے کہ ان کی عدم موجودگی میں ہم وہاں آئے تھے اور تجوری کھلوائی تھی، پھر کیا ہوگا۔''

''کچھ بھی نہیں ہوگا۔ تم بتا دینا کہ تمہیں کس حد تک مجبور کر دیا گیا تھا۔''

''لیکن ہمارے والد کی طرح آئی جی صاحب بھی وہ آدمی ہیں کہ ملک اور قوم کی کوئی امانت دشمن کے حوالے کسی قیمت پر نہیں کرتے۔ چاہے ان کے سامنے ان کے سارے خاندان کو ذبح کر دیا جائے۔''

''ہوں گے، مجھے اس سے کیا۔ میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ اس ڈبیا کو تجوری سے اڑانے کی صورت میں ہی تم اپنی والدہ اور بہن کو زندہ حالت میں دیکھ سکو گے۔''

''ہوں، خیر آگے چلو۔ ڈبیا حاصل کرنے کے بعد ہمیں کیا کرنا ہوگا۔ کیا اسے لے کر یہاں آئیں۔''

''یہاں تم نہیں آ سکو گے۔ اس جگہ کو تو تمہارے فرشتے بھی تلاش نہیں کر سکیں گے۔ ڈبیا لے کر تمہیں ہوٹل زوالو کے کمرہ نمبر دو سو پندرہ میں

جانا ہوگا۔ وہاں البرٹ جان نامی ایک شخص موجود ہوگا، تم ڈبیا اس کے حوالے کر دو گے۔ البرٹ جان کو آج رات ہی دو بجے کے جہاز سے جانا ہے۔ اس کے جہاز میں سوار ہونے اور سوار ہونے کے بعد دو گھنٹے تک پرواز کرنے کے بعد تمہاری والدہ اور بہن کو اس عمارت سے نکال کر تمہارے گھر سے کچھ فاصلے پر کسی جگہ چھوڑ دیا جائے گا اور وہ گھر پہنچ جائیں گی۔ یہ ہے میرا منصوبہ، اگر البرٹ جان جہاز میں سوار ہوتا نہ دیکھا گیا یا جہاز کو پرواز کرتے نہ دیکھا گیا تو ان دونوں کو ختم کر دیا جائے گا۔ اب کہو، تم یہ کام کرنے کے لیے تیار ہو یا نہیں۔''

''اگر تم بتا دیتے کہ ڈبیا میں کیا ہے تو ہم فوری طور پر یہ فیصلہ کر سکتے تھے۔'' محمود نے جلدی سے کہا۔

''فیصلہ تو اب بھی تمہیں فوری طور پر ہی کرنا ہے۔ چلو بھئی پہلے ان دونوں کو ان کی والدہ اور بہن دکھا دو، تاکہ انہیں یقین آ جائے کہ جو کچھ میں نے کہا ہے، اس میں ذرا بھی جھوٹ نہیں ہے۔''

چلو۔'' ان میں سے ایک نے کہا۔

دونوں ان کے ساتھ باہر نکلے۔ اسی وقت محمود نے فاروق کی طرف دیکھا۔

''تم لوگ شاید ہمیں چکر دے کر بھاگ نکلنے کے بارے میں سوچ رہے ہو۔'' انہیں ساتھ لانے والوں میں سے ایک نے کہا۔

''ارے نہیں، بھلا ہم یہاں سے بھاگ کیسے سکتے ہیں۔'' فاروق چہکا۔

''سنو، یہ محل ایک قلعے کی طرح ہے۔ یہاں ہر طرف خفیہ طور پر

نگران موجود ہیں۔ اس وقت تم نہ جانے کتنی نظروں کے سامنے ہو۔ یہ خیال نہ کرنا کہ ہم صرف دو آدمی تمہارے آس پاس موجود ہیں۔ یہاں صرف باس کا حکم چلتا ہے۔ باس کے اشارے پر لوگوں کو یہاں الٹا لٹکا دیا جاتا ہے۔ بھاگنے کی پہلی کوشش بھی انتہائی خطرناک ثابت ہوگی۔ محل سے نکلنا تو بہت دور کی بات ہے۔''

''بات دور کی ہو یا نزدیک کی، ہمیں اس سے کیا، یوں بھی دور کے ڈھول سہانے ہوتے ہیں۔'' فاروق منمنایا۔

''یہاں اس ضرب المثل کی کیا ضرورت تھی۔'' محمود نے اسے گھورا۔

''ضرورت کا کیا ہے، بلا ضرورت بھی ضرورت محسوس کی جا سکتی ہے۔'' فاروق نے کہا۔

''شاید تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے۔'' محمود یہ کہہ کر اس کی طرف جھپٹا۔ فاروق بھڑک کر بھاگا، لیکن پھر فوراً ہی وہ ٹھٹک کر رک گئے۔ کئی دونالی بندوقیں دیواروں کے سوراخوں سے جھانکنے لگی تھیں۔

''بھئی ہم تمہاری تمام حرکتوں سے اچھی طرح واقف ہیں۔'' ایک ہنسا۔

''دھت تیرے کی۔ کرا دیا نا ذلیل۔'' محمود نے بھنا کر کہا۔

''مجھ پر تم جھپٹے تھے، میں تم پر نہیں۔'' فاروق نے منہ بنایا۔

دونوں ایک بار پھر ان کے آگے آگے چلنے لگے۔ آخر ایک کمرے کے دروازے پر انہیں رکنے کے لیے کہا گیا۔

''ہم دروازہ کھول رہے ہیں۔ تم باہر رہ کر ہی ان دونوں کو دیکھو

گے۔ آپس میں کوئی بات چیت بھی نہیں کرو گے؟''

''کیوں بات چیت کرنے میں کیا حرج ہے؟''

''باس کا حکم، وہ تمہیں ہم لوگوں کی نسبت زیادہ جانتے ہیں۔'' اس نے کہا۔

''یہ سن سن کر کان پک گئے۔ آخر یہ شخص ہمیں کس طرح جانتا ہے۔''

''ہمیں نہیں معلوم۔'' اس نے بھی برا سا منہ بنایا اور ساتھ ہی دروازہ کھل گیا۔ اندر والوں نے دروازے پر موجود لوگوں کو حیران ہو کر دیکھا اور ادھر دروازے والوں کی آنکھیں اندر کا منظر دیکھ کر حیرت سے پھیل گئیں۔ ایک پلنگ دیوار کے ساتھ بچھا تھا اور دوسرا اس پر کھڑا تھا۔

''یہ۔ یہ سب کیا ہے؟'' انہیں لانے والوں میں سے ایک نے کہا۔

''باہر جھانکنے کی کوشش۔'' فرزانہ نے کندھے اچکائے پھر ان سے بولی:

''ہیلو، محمود، فاروق۔ تو تم یہاں آ ہی گئے۔ شاید تمہیں جنگل سے براہ راست یہاں لایا گیا ہے۔ میرا مطلب ہے، تمہیں گھر جانے کا موقع تو نہیں دیا گیا ہوگا۔''

''نہیں۔'' فاروق بولا۔

''تم لوگوں کو آپس میں باتیں کرنے کی اجازت نہیں ہے۔'' ایک نگران غرایا۔

''تم دیکھ ہی چکے ہو کہ تمہاری والدہ اور بہن یہاں موجود ہیں۔

یہ بھی دیکھ لیا ہوگا کہ یہ اصلی ہی ہیں۔ میک اپ میں کوئی اور نہیں ہیں۔ اب بس، یہ ملاقات ختم۔''

''ارے ارے، کم از کم دو باتیں تو کرنے دو۔'' فرزانہ نے گھبرا کر کہا۔

''ہرگز نہیں، باس کا حکم یہی ہے۔'' یہ کہہ کر انہوں نے محمود اور فاروق دونوں کو دھکیل کر کمرے سے باہر نکال دیا اور دروازہ باہر سے بند کر کے تالا لگا دیا۔

''عجیب سنگ دل لوگ ہو بھئی۔'' محمود نے جھلا کر کہا۔

''ہاں، اب تم باتیں کر سکتے ہو اور یہ بھی بتا دوں، تمہاری بہن پاگل ہے، وہ روشندان میں سے جھانکنے میں ہرگز کامیاب نہیں ہوگی۔''

''اسے کامیابی اور ناکامی کی کوئی پروا نہیں ہوتی۔ وہ تو بس کام کرتے رہنے کی عادی ہے۔ شاید اس نے سوچا ہوگا، اس طرح وقت ہی گزرے گا۔''

''چلو اب تم وقت گزارنے کی کوشش نہ کرو۔''

جلد ہی وہ پھر باس کے کمرے میں موجود تھے اور وہ ان سے کہہ رہا تھا:

''تمہیں یقین آ گیا ہوگا کہ تمہاری والدہ اور بہن ہماری قید میں ہیں۔ اگر اب بھی کوئی شک ہے تو اپنے گھر کے نمبر ڈائل کر کے دیکھ لو، وہاں سے کوئی ریسیور نہیں اٹھائے گا۔ انسپکٹر جمشید بھی اس وقت تم لوگوں کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے ہوں گے، لہذا وہ بھی گھر نہیں ملیں گے۔''

''ٹھیک ہے، میں تصدیق ضرور کروں گا۔'' محمود نے کہا۔ باس

نے پاس رکھے فون کی طرف اشارہ کیا۔ محمود نے نمبر ڈائل کرتے ہوئے اس فون کے نمبر دیکھنے کی کوشش کی۔ لیکن اس پر کوئی نمبر لکھے ہوئے نہیں تھے۔ دوسری طرف گھنٹی بجتی رہی اور پھر کچھ سوچ کر محمود نے دوبارہ نمبر ڈائل کرنے شروع کر دیے۔ اس مرتبہ اس نے بیگم شیرازی کے نمبر ڈائل کیے۔ دوسری طرف سے فوراً ریسیور اٹھایا گیا۔

''ہیلو، بیگم شیرازی بول رہی ہوں۔''

''اور میں محمود۔ کیا گھر میں کوئی نہیں ہے، میرا مطلب ہے، امی اور فرزانہ بھی نہیں ہیں۔''

''نہیں، وہ غائب ہیں۔ مگر تم کہاں سے بول رہے ہو۔ تمہارے ابا جان سارے شہر میں تمہیں تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔''

''میں خود بھی نہیں جانتا کہ ہم کہاں ہیں۔'' یہ کہہ کر محمود نے ریسیور رکھ دیا اور باس کی طرف مڑا:

''گھر کا فون کسی نے نہیں اٹھایا تھا، لہذا میں نے اپنی پڑوسی کو فون کر کے معلوم کیا ہے۔''

''کوئی بات نہیں، میں بیگم شیرازی کے بارے میں بھی جانتا ہوں۔'' باس نے مسکرا کر کہا۔

''حیرت ہے، آپ کو ہمارے بارے میں اتنی باتیں کس طرح معلوم ہیں؟''

''وہ تمام اخبارات اور رسائل میں نے پڑھے ہیں، جن میں تم لوگوں کے کارنامے شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی میں نے بہت سے لوگوں سے معلومات حاصل کی ہیں۔ تمہارے گھر، سکول اور دفتر کی مسلسل

نگرانی کرائی ہے اور تمام معمولات معلوم کیے ہیں۔ ایسے ہی تو تم یہاں نظر
نہیں آ رہے ہو۔ اب جب کہ تمہیں یہ یقین آ گیا ہے کہ تمہاری والدہ اور بہن
یہاں موجود ہیں تم نے کیا فیصلہ کیا ہے۔''

''یہی کہ ہم تمہارا کام کریں گے۔'' محمود نے فیصلہ کن انداز میں
کہا اور فاروق اسے گھورنے لگا۔

''بہت خوب، لیکن شاید تمہارے بھائی کو تمہارا یہ فیصلہ پسند نہیں
آیا۔'' باس نے فاروق کی نظروں کا مطلب سمجھتے ہوئے کہا۔

''پسند آیا ہو یا نہ آیا ہو، یہ میرا ساتھ دے گا۔''

''تب پھر تم اسی وقت یہاں سے روانہ ہو کر آئی جی کی کوٹھی میں
پہنچ جاؤ۔ ترکیب تم راستے میں سوچ لینا۔ ویگن میں تمہیں آئی جی کی کوٹھی سے
کچھ فاصلے پر چھوڑ دیا جائے گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' محمود نے کہا۔

''کام ختم کرنے کے بعد، میرا مطلب ہے، گھونگھے نما ڈبیا البرٹ
جان کے حوالے کرنے کے بعد تم سیدھے گھر واپس چلے جاؤ گے۔ اکرام
اور دوسرے لوگوں کو اطلاع دو گے کہ تم لوگ گھر پہنچ گئے ہو، لہٰذا تلاش کا
سلسلہ ختم کر دیا جائے۔ اس کے بعد جہاز کی پرواز کے دو گھنٹے بعد تمہاری
والدہ اور تمہاری بہن کو بھی شہر کے کسی حصے میں اتار دیا جائے گا۔ وہ کسی نہ
کسی طرح گھر تک پہنچ جائیں گی۔ میں اپنے قول اور فعل کا بہت پابند ہوں۔
جو کہا ہے، وہی کروں گا، بشرطیکہ تم کسی موڑ پر دھوکا نہ دو۔''

''اچھی بات ہے، نہیں دیں گے دھوکا۔ آج کل تو ہمیں خود
ضرورت ہے۔'' فاروق نے کہا۔

''کس چیز کی ضرورت ہے۔'' باس نے اسے گھورا۔

''اوہ سوری، آپ تو میری زبان سے اچھی طرح واقف ہی
ہیں۔ اب آپ کو کیا بتاؤں۔'' فاروق نے بوکھلا کر کہا اور محمود کی طرف
دیکھنے لگا۔

''لے جاؤ انہیں۔ اور تمام ہدایات پر پوری طرح عمل کرنا، اور
ہاں، تم دونوں یہ بھی سن لو کہ میرے ان دونوں آدمیوں کو کسی قسم کا نقصان
پہنچایا یا یہ دیر سے لوٹے تو تمہاری والدہ اور بہن کی زندگی خطرے میں پڑ
جائے گی۔''

''بہت اچھا، ہم اچھی طرح سمجھ گئے، آپ فکر نہ کریں۔''

''باس، ایک بات رہ گئی۔'' ایک نگران کچھ کہتے کہتے رکا۔

''میرے خیال میں تو کوئی بات نہیں رہ گئی۔'' باس نے اسے
گھورا۔

''ان کی بہن روشن دان کے ذریعے باہر جھانکنے کی کوششوں میں
مصروف ہے۔''

''مجھے معلوم ہے، وہ یہ کوشش کیے بنا نہیں رہے گی۔'' اس نے
ہنس کر کہا: ''لیکن تم فکر نہ کرو۔ اس کا ہر طرح جائزہ لے لیا گیا ہے۔ وہ
روشن دان تک نہیں پہنچ سکتی۔''

''بہت اچھا باس، ہم ان دونوں کو لے کر جا رہے ہیں۔ آؤ
بھئی۔'' اس نے کہا اور ان دونوں کو لے کر باہر نکلے۔ ایک بار پھر انہیں
برآمدوں کے چکر کاٹنے پڑے۔ آخر ایک گیراج کا اندرونی دروازہ کھول کر
وہ اس میں داخل ہوئے۔ یہاں کئی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ انہیں ایک ویگن

میں بٹھایا گیا۔ دروازہ بند کر دیا گیا اور پھر ویگن کا انجن سٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی۔ انہوں نے دیکھا، ویگن کے شیشے بالکل اندھے تھے اور وہ ان سے باہر کچھ بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔

''یار، یہ لوگ تو بہت چالاک ہیں۔'' فاروق بولا۔

''ہاں، ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ اب ہم باہر کچھ بھی نہیں دیکھ سکیں گے، لہذا اب اس کے ٹھکانے کے بارے میں کوئی اندازہ نہیں لگا سکتے۔'' محمود نے کہا۔

''دیکھا جائے گا۔ اس کم بخت نے تو بری طرح ہمیں اپنے قابو میں کر لیا ہے۔'' فاروق قدرے جھلا کر بولا۔

ویگن اب پوری رفتار سے چلی جا رہی تھی۔

''تم نے کیا سوچا ہے؟'' فاروق نے دبی آواز میں کہا۔

''ہم کر ہی کیا سکتے ہیں۔ ڈبیا کو چرائے بغیر کوئی چارہ بھی تو نہیں۔'' محمود نے مایوسانہ انداز میں کہا۔

''لیکن یہ دیکھ لو کہ اس میں نہ جانے کتنا قیمتی راز ہوگا۔''

''دیکھ رہا ہوں اور سوچ رہا ہوں۔ ہم بالکل مجبور ہو کر رہ گئے ہیں فاروق۔ کوئی راستہ سجھائی نہیں دیتا۔''

''اللہ رحم فرمائے، کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم ابا جان، امی جان فرزانہ اور آئی جی صاحب کی نظروں میں گر جائیں۔ ابا جان ہمیں یہ طعنہ دیں کہ تم نے اپنی ماں اور بہن کی خاطر ملک کی عزت داؤ پر لگا دی۔''

''اب تم ہی بتاؤ، ہم کیا کر سکتے ہیں۔ اگر ڈبیا کو نہ چرائیں تو امی جان اور فرزانہ کی لاشیں دیکھنے کو ملیں گی۔''

''ٹھیک ہے، اب یہی کرنا ہوگا۔'' فاروق نے تھکی تھکی آواز کہا۔

ویگن تقریباً پینتالیس منٹ تک چلتی رہی۔ آخر اس کی رفتار آہستہ ہونے لگی، پھر وہ رک ہی گئی۔ دروازہ کھلا اور نگران کی آواز سنائی دی۔

''نیچے اتر آؤ، یہاں سے تم بہت جلد آئی جی صاحب کی کوٹھی تک پہنچ جاؤ گے۔''

وہ نیچے اتر آئے۔ انہوں نے دیکھا، ایک سنسان سڑک پر کھڑے تھے۔ ان کے اترنے کے فوراً بعد دروازہ بند کر دیا گیا اور نگران نے ویگن میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

''اس طرف چل پڑو۔ کسی گزرتی ہوئی گاڑی میں لفٹ لے لینا شہری حدود میں پہنچنے کے بعد تو تمہیں کوئی ٹیکسی مل ہی جائے گی۔ تمہاری نقدی جوں کی توں تمہاری جیبوں میں ہے۔''

''شکریہ جناب۔'' محمود نے کہا اور شہر کی طرف قدم اٹھا دیے۔ فاروق نے اس کا ساتھ دیا۔ اپنے پیچھے انہوں نے گاڑی جانے کی آواز سنی۔ مڑ کر دیکھا تو وہ اس سڑک پر شہر کے مخالف سمت میں چلی جا رہی تھی۔

''اس سڑک کو یاد رکھنا۔ شہری حدود میں داخل ہوتے ہی اس سڑک کا نام وغیرہ پوچھ لینا چاہیے۔'' محمود بولا۔

''ٹھیک ہے۔''

دونوں بہت دیر تک پیدل چلتے رہے۔ پھر انہوں نے اپنے پیچھے ایک گاڑی کی لائٹیں محسوس کیں۔ مڑ کر دیکھا تو ایک کار آ رہی تھی۔

''لو بھئی، بن گیا کام۔'' فاروق نے خوش ہو کر کہا۔

''کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کام بن رہا ہے یا بگڑ رہا ہے۔ آنے والی

کار میں اگر لفٹ مل گئی اور ہم جلد آئی جی صاحب کی کوٹھی تک پہنچ گئے تو بھی ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہمارا کام بن گیا ہے۔'' محمود نے کہا۔

''ہاں یہ تو تم ٹھیک کہتے ہو، لیکن تم ہی تو کہہ رہے تھے اب ہم کر ہی کیا سکتے ہیں۔'' فاروق بولا۔

''ہاں، ٹھیک ہے۔''

اتنے میں گاڑی نزدیک پہنچ گئی۔ یہ ایک کار تھی۔ چھوٹی سی خوب صورت کار۔ محمود اور فاروق نے اسے رکنے کے لیے ایک ساتھ ہاتھ بڑھا دیے۔ کار ان کے قریب آکر رک گئی۔ انہوں نے دیکھا، اندر ایک شخص عینک لگائے بیٹھا تھا۔ صاف ستھرے لباس میں تھا اور ہر چیز سے دولت مندی ٹپک رہی تھی۔

''کیا بات ہے بھئی تم دونوں رات کے وقت اس سنسان سڑک پر کیا کر رہے ہو۔''

''یقین کیجیے، ہم سیر نہیں کر رہے۔'' فاروق بول اٹھا۔

''کیا مطلب؟''

''دراصل ہمیں اغوا کر لیا گیا تھا۔ اغوا کرنے والے اب ہمیں اس سڑک پر چھوڑ گئے ہیں۔ ہمیں شہر تک جانا ہے، کیا آپ ہمیں شہر تک لفٹ دے سکیں گے۔''

''کیوں نہیں، اغوا کرنے والوں کو ان کے مطالبے کی رقم مل گئی ہوگی، تبھی تو انہوں نے تمہیں چھوڑ دیا۔''

''جی ہاں، شاید ایسا ہی ہوا ہے۔''

''خیر بیٹھ جاؤ پیچھے۔'' اس نے کہا اور ہاتھ پیچھے لا کر دروازہ

کھول دیا۔ دونوں اندر بیٹھ گئے۔ کار ایک بار پھر چل پڑی۔

''آپ بہت دلیر ہیں۔ ایک سنسان سڑک پر کار روک لی۔ اور اگر ہم ڈاکوؤں کے ساتھی ہوتے۔''

''اللہ مالک ہے، میں دوسروں کی مدد کرنے کا موقع نہیں گنواتا۔'' اس نے کہا۔

''ہم اپنے محسن کا نام پوچھ سکتے ہیں۔''

''مجھے محسن نہ کہو۔ میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا۔ میرا نام سرور رضائی ہے۔ یہاں محکمہ داخلہ میں ایک اچھی پوسٹ پر ملازم ہوں۔''

''شکریہ جناب۔'' محمود بولا۔

''تم دونوں کو کہاں اترنا ہے۔''

''جانا تو ہمیں رحیم روڈ پر ہے۔ آپ جہاں بھی اتار سکیں۔ شہر میں تو ہم ٹیکسی سے بھی چلے جائیں گے، اصل مسئلہ تو یہاں کا تھا۔''

''ٹھیک ہے، میں رحیم روڈ کے نزدیک ہی علاقے میں رہتا ہوں۔ تمہیں عین رحیم روڈ پر اتار دوں گا۔''

''شکریہ جناب، لیکن اس طرح آپ کو زحمت ہوگی۔''

''ہرگز نہیں، اس میں زحمت کی بھلا کیا بات ہے۔''

''آپ۔ آپ بہت اچھے ہیں۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں۔ اس سڑک کا نام کیا ہے اور یہ دوسری طرف کہاں تک جاتی ہے۔''

''یہ سڑک بھوپالی روڈ کہلاتی ہے۔ یہ ہمارے ملک کی سب سے بڑی سڑک ہے اور ملک کے دوسرے سرے تک جاتی ہے۔''

''لیکن آپ اتنی رات گئے کہاں سے آ رہے ہیں۔''

''میرے ایک عزیز بیمار تھے۔ دوسرے شہر میں رہتے ہیں۔ ان کی عیادت کے لیے گیا تھا۔'' سرور رضائی نے بتایا: ''تم دونوں کے نام کیا ہیں؟''

''جی۔ میں محمود ہوں اور یہ فاروق۔''

''محمود اور فاروق، یہ نام تو کچھ جانے پہچانے سے لگتے ہیں۔''

''ہوسکتا ہے۔ آپ نے یہ نام اکثر سنے ہوں۔'' محمود مسکرایا۔

''ہاں، ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔'' اس نے الجھن کے عالم میں کہا، لیکن اس موقع پر وہ اپنے بارے میں کچھ بتانا نہیں چاہتے تھے۔

''آخر آدھ گھنٹے بعد وہ رحیم روڈ پر آئی جی صاحب کی کوٹھی کے سامنے پہنچ گئے۔ ان کے بتانے پر سرور رضائی نے کار روک لی۔ وہ نیچے اترے اور سرور رضائی کا بہت بہت شکریہ ادا کیا۔ جب کار آگے بڑھ گئی تو انہوں نے آئی جی صاحب کی کوٹھی کا رخ کیا۔ سڑک پر اکا دکا گاڑیاں گزر رہی تھیں۔ انہوں نے ان گاڑیوں کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور دروازے پر پہنچ کر باوردی نگران سے بولے:

ہمیں اعجاز اور سہیل صاحبان سے ملنا ہے۔'' یہ آئی جی صاحب کے دونوں بیٹوں کے نام تھے۔ انہوں اچھی طرح جانتے تھے۔

''آپ کا نام؟''

''محمود اور فاروق، ہم انسپکٹر جمشید کے بیٹے ہیں۔''

''آئیے، ڈرائنگ روم میں تشریف رکھیے۔ میں انہیں اطلاع کیے دیتا ہوں۔'' ان میں سے ایک نے کہا۔

اور ان دونوں کو ڈرائنگ روم میں بٹھا کر وہ کمرے سے نکل گیا۔

''لو بھئی، ان دونوں کے آنے سے پہلے کوئی ترکیب سوچ لو۔'' محمود نے سرگوشی کی۔

''کیسی ترکیب؟'' فاروق چونکا۔

''تجوری کھلوانے کی، ہم نے اب تک یہ تو سوچا ہی نہیں کہ تجوری کس ترکیب سے کھلوائیں گے۔''

''اوہ۔'' فاروق کے منہ سے بے ساختہ انداز میں نکلا۔

انہوں نے واقعی یہ ترکیب تو سوچی ہی نہیں تھی۔

☆☆☆

کمرے میں کوشش

دروازہ بند ہوتے ہی فرزانہ اکڑوں بیٹھ گئی اور سر کو دونوں ہاتھوں میں پکڑ لیا۔ یہ اس کی خاص عادت تھی۔ جب کوئی مشکل مسئلہ پیش آتا اور اس کا کوئی حل نہ سوجھتا تو وہ یہی کیا کرتی تھی۔

''ہاں تو تم کیا کہہ رہی تھیں فرزانہ؟'' بیگم جمشید نے بے چینی کے عالم میں پوچھا۔

''یہ کہ ہمارے پاس ایک کافی لمبی رسی موجود ہے۔ چھت میں ایک کنڈا لگا ہوا ہے۔ ان دو چیزوں کے علاوہ وہ بھاری پلنگ بھی موجود ہیں۔ ان چیزوں سے کام لے کر میں کسی طرح اس روشندان تک پہنچ جانا چاہتی ہوں، تاکہ یہ دیکھ سکوں کہ اس عمارت کے باہر کیا ہے۔''

''لیکن نظر تو نہیں آتا کہ تم اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکتی ہو۔''

''یہی تو دیکھنا ہے کہ میں کس طرح کامیاب ہو سکتی ہوں۔'' فرزانہ نے کہا۔ اور پھر سوچ میں گم ہو گئی۔ اچانک اس نے کہا:

''وہ مارا، آ گئی ترکیب ذہن میں، میں بھی سوچ رہی تھی، میرے ذہن کو ہوا کیا ہے۔ کوئی ترکیب ذہن میں آ کیوں نہیں رہی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ میں آپ، محمود اور فاروق کے لیے پریشان ہوں۔''

''جلدی بتاؤ، کیا ترکیب سوچی ہے تم نے؟''

''میں یہ رسی اس کنڈے میں پھنساؤں گی۔'' یہ کہہ کر وہ رسی کے ایک سرے پر پھندا بنانے لگی، پھر رسی کو گھما کر کنڈے کا نشانہ لے کر اس پر پھینکا۔ پھندا کنڈے سے ذرا فاصلے پر لگا اور نیچے آ رہا۔ اس نے پھر رسی اوپر اچھالی۔ اس مرتبہ پھندا کنڈے سے ٹکرایا ضرور، لیکن اس میں اٹک نہ سکا۔ تیسری مرتبہ پھندا کنڈے سے کافی فاصلے پر چھت سے ٹکرایا اور بیگم جمشید نے نفی میں سر ہلایا۔

''نہیں فرزانہ، یہ بہت مشکل ہے اور پھر اگر کنڈے میں رسی پھنس بھی گئی تو تم کیا کر لو گی۔'' انہوں نے کہا۔

''بس دیکھتی جائیے، کوشش کرنا ہمارا کام ہے، مدد کرنے والا اللہ ہے۔''

یہ کہہ کر اس نے پھر پھندا اچھالا اور خدا کی قدرت کہ اس مرتبہ پھندا عین کنڈے میں جا گرا۔ یہ دیکھ کر فرزانہ کی خوشی سے باچھیں کھل گئیں۔ اس نے رسی کو کھینچ کر پھندا کس دیا۔ اب وہ کنڈے میں سے نکل نہیں سکتا تھا۔ اس نے رسی پر لٹک کر اس کی مضبوطی کا اندازہ لگایا، پھر اسے دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر روشندان کے مخالف سمت میں چلی گئی۔ اب اس نے رسی کو دونوں ہاتھ پوری طرح اونچے کر کے جہاں تک ممکن ہو سکتا تھا، اوپر سے پکڑا اور ایک دم اس سے لٹک گئی۔ نتیجہ یہ کہ وہ تیزی سے روشن دان والی دیوار کی طرف گئی، اس طرح جیسے بچے جھولا جھولتے ہیں۔

''امی جان، اب آپ مجھے جھولا دینا شروع کیجیے۔ جھولا رفتہ رفتہ اونچا ہوتا جائے گا، شاید میرا ہاتھ روشن دان کی سوراخ تک جا پہنچے۔''

"کہتی تو تم ٹھیک ہو۔" پہلی مرتبہ اس کی ترکیب بیگم جمشید کی سمجھ میں آئی اور انہوں نے زور شور سے فرزانہ کو جھولا دینا شروع کیا۔ دوسری دیوار کے نزدیک پہنچتے ہی فرزانہ ایک ہاتھ رسی سے ہٹا لیتی اور اسے دیوار سے چھو کر یہ اندازہ لگاتی کہ ابھی وہ روشندان کتنا اونچا ہے، لیکن ابھی تو وہ فرش اور روشندان کے درمیانی فاصلے کو بھی نہیں چھو سکی تھی۔ آخر اس نے کہا۔

"اس طرح کام نہیں چلے گا امی جان۔"

"تو پھر کیسے چلا گا۔" انہوں نے کہا۔

"ایک پلنگ کے اوپر دوسرا پلنگ رکھ کر میں رسی کو اوپر سے پکڑتی ہوں۔ اس کے بعد آپ مجھے پورے زور سے جھولا دینا شروع کریں۔ اس طرح شاید کامیابی ہو جائے۔"

'اچھا، جیسے تمہاری مرضی۔"

انہوں نے اس ترکیب پر عمل کیا اور جھولا شروع کیا۔ فرزانہ کا ہاتھ کئی بار روشندان کی سلاخوں سے چھوتے چھوتے بچا۔ اس نے پر جوش لہجے میں کہا:

"ہم کامیابی کے بہت نزدیک ہیں امی جان، اور زور لگائیے۔"

بیگم جمشید اس وقت ہانپنے لگی تھیں۔ انہوں نے کب ایسے کام کیے تھے؛ تاہم انہوں نے فرزانہ کو پورے زور سے دھکیلا اور اس کا ہاتھ روشندان سے چند انچ آگے نکل گیا۔ واپس لوٹنے سے پہلے ہی وہ اپنے ہاتھ کو موڑ چکی تھی۔ اسے ایک زوردار جھٹکا لگا اور سلاخ پر ہاتھ مضبوطی سے جم گیا۔ دوسرے ہاتھ میں اس نے رسی کو تھام رکھا تھا، لیکن اس طرح وہ باہر جھانکنے کے قابل نہیں تھی۔ آخر اس نے رسی کو منہ میں دبایا اور دوسرا ہاتھ بھی دوسری سلاخ پر جما دیا

۔ اب وہ دونوں ہاتھوں سے سلاخیں تھامے دیوار کے ساتھ لٹک رہی تھی۔ رسی اس کے منہ دبی ہوئی تھی اور اس نے باہر نظریں جما دیں۔ باہر اسے ایک سڑک نظر آئی۔ سڑک کے دوسری طرف بھی مکانات تھے۔ بالکل سامنے والے مکان کے دروازے پر ایک نیم پلیٹ لگی ہوئی تھی۔ اس پر میجر تنویر خان کا نام لکھا تھا۔ فرزانہ کے لیے بس اتنا ہی کافی تھا۔ اس نے پہلے ایک ہاتھ سلاخ سے ہٹایا۔ اس سے رسی کو تھاما اور پھر دوسرا ہاتھ بھی ہٹا لیا۔ اب اس کے دونوں ہاتھ رسی پر تھے اور وہ نیچے پھسل رہی تھی۔ فرش پر اترتے ہی اس نے سرگوشی کی۔

"کام ہو گیا امی جان، خدا کا شکر ہے۔"

"یا اللہ تیرا شکر ہے۔" انہوں نے بھی کہا۔

"اب ان دونوں پلنگوں کو ان کی جگہ پر رکھ دیں۔" فرزانہ نے اوپر والے پلنگ کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

ابھی وہ پلنگوں کو ان کی جگہ پر رکھ کر فارغ ہی ہوئی تھیں کہ دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ فرزانہ جلدی سے رسی کی طرف بڑھی۔ بیگم جمشید کی آنکھوں میں خوف دوڑ گیا۔

☆☆☆

ترکیب کی تلاش

''تو پھر اس سے پہلے کہ اعجاز اور سہیل یہاں آئیں۔ ہمیں ترکیب سوچ لینی چاہیے۔'' فاروق نے بوکھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ضرور سوچ لینی چاہیے، تم بھی ذہن پر زور دو، میں بھی زور د ہوں۔''

''زور تو میں دیے دیتا ہوں، لیکن کاش اس وقت یہاں فرزانہ ہوتی یہ کام وہ منٹوں میں کر لیتی۔''

''خیر چھوڑو، اب خود پر بھروسہ کرو اور ترکیب کی تلاش میں دماغ ادھر ادھر گھماؤ پھراؤ۔''

''ترکیب کی تلاش۔ بھئی واہ، یہ تو کسی ناول کا نام بن سکتا ہے۔''

''دھت تیرے کی۔ اس طرح تو سوچ چکے ہم ترکیب۔'' محمود جھلا کر ران پر ہاتھ مارا۔

''اوہ سوری۔'' فاروق نے کہا اور ہونٹوں کو مضبوطی سے بند کر لیا۔ محمود بھی سوچ میں گم ہو گیا۔ آخر محمود نے چٹکی بجائی۔

''آ گئی ترکیب ذہن میں، سنو۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنا منہ فاروق کے کان سے لگا دیا۔

اسی وقت قدموں کی چاپ سنائی دی۔ دونوں جلدی سے الگ ہو گئے۔ محمود اس وقت تک ترکیب بتا چکا تھا اور فاروق حیران ہو رہا تھا۔ حیرت اسے اس بات پر ہو رہی تھی کہ محمود بھی ترکیب سوچنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

''ہیلو محمود، فاروق، بھئی کمال ہے، یہ کون سا وقت ہے آنے کا۔ شام کے وقت آئے ہوتے۔ تفریح کا پروگرام بناتے۔'' امتیاز نے چہکتے ہوئے لہجے میں کہا۔ دونوں پندرہ سالہ سال کی عمر کے خوش شکل لڑکے تھے۔

''تفریح ہماری قسمت میں کہاں، ہم تو ایک ضروری کام سے آئے ہیں۔''

''ضروری کام سے، کیا مطلب؟''

''انکل تو ملک سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ اب اصل بات ہم تم کو ہی بتا سکتے ہیں۔'' محمود نے پراسرار لہجے میں کہا۔

''خیر تو ہے۔''

''ہمیں ایک خوف ناک اطلاع ملی ہے، ہم صرف اس اطلاع کی تصدیق کرنے کے لئے آئے ہیں۔ اگر کوئی خطرے والی بات نہ ہوئی تو خاموشی سے واپس چلے جائیں گے، ورنہ ہمیں حفاظت کا انتظام کرنا ہوگا۔''

''ہماری تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا، تم کیا کہہ رہے ہو۔'' سہیل نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

''بات یوں تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی۔ پہلے یہ بتاؤ، انکل کی تجوری کی چابی کس کے پاس ہے۔''

''امی جان کے پاس۔'' امتیاز بولا۔

"ان سے چابی غیر محسوس طور پر لے سکتے ہو یا نہیں، ورنہ معاملہ ان کے علم میں لانا پڑے گا، لیکن ڈر ہے کہ وہ بوکھلاہٹ کا شکار نہ ہو جائیں۔"

"چابی تو ہم چٹکی بجاتے لا سکتے ہیں، کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ وہ کہاں رکھتی ہیں۔ دوسرے ہمارے تجوری کھولنے پر پابندی بھی نہیں ہے۔ ہماری اپنی بھی کچھ چیزیں تجوری میں رکھی ہیں۔ اور ہم ضرورت پڑنے پر چابی لا کر اسے کھول لیتے ہیں۔"

"بس تو پھر ٹھیک ہے۔ اب میں تمہیں اصل بات بتاتا ہوں۔ تمہاری کوٹھی کا نمبر سی گیارہ ہے نا۔"

"بالکل یہی ہے۔"

"تمہیں شاید ہماری تجربہ گاہ کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ ہم نے ایک تجربہ گاہ بنا رکھی ہے۔ اس پر ہم شہر کے جرائم پیشہ لوگوں کو باتیں سنا کرتے ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہم نے سی گیارہ رحیم روڈ کے بارے میں دو آدمیوں کو بات چیت کرتے سنا تھا۔ ہم نے فوراً ٹیلی فون ڈائریکٹری نکالی اور اس نمبر کی تلاش شروع کر دی۔ آخر پتا چلا کہ یہ نمبر تو آپ لوگوں کا ہے۔ اب تو ہم بہت گھبرائے۔ گفتگو ہماری سمجھ میں نہیں آ سکی، لہٰذا ہم سیدھے یہاں آ گئے۔"

"کیا مطلب؟" امتیاز چونکا۔

"ہمارا اندازہ ہے کہ وہ لوگ یہاں سے کوئی چیز اڑانا چاہتے ہیں، لہٰذا ہم انکل کی تجوری کو ایک نظر دیکھنا چاہتے ہیں۔ کہیں اس میں کوئی خفیہ کاغذات تو نہیں رکھے۔ اگر تجوری میں صرف زیورات اور نقدی ہوئی تو فکر کی کوئی بات نہیں اور اگر اس میں کوئی خاص چیز ہوئی تو ہمیں حفاظتی

انتظامات کرنے ہیں۔"

"وہ تو یہاں پہلے سے موجود ہیں۔" سہیل نے مسکرا کر کہا۔

"تمہارا مطلب ان دو پہرے داروں سے ہے۔"

"نہیں، اس کے علاوہ بھی انتظامات ہیں۔ کوئی شخص اگر تجوری کھولنے کی کوشش کرے گا تو ایک تو پوری کوٹھی میں خطرے کا الارم بجنے لگتا ہے۔ دوسرے کھولنے کی کوشش کرنے والے کو بجلی کا جھٹکا لگتا ہے۔"

"وری گڈ، خیر ہم اپنا اطمینان تو کرنا چاہیں گے۔" محمود نے جلدی سے کہا۔

"ہاں ضرور۔ امتیاز، تم انہیں لے کر ڈیڈی کے کمرے میں لے جاؤ، میں چابی لے کر آتا ہوں۔ تم الارم کا کنکشن نکال دو اور بجلی کے جھٹکے کا بھی۔"

"تو کیا کنکشن ہر وقت لگا رہتا ہے؟"

"نہیں صرف رات کے وقت۔"

محمود اور فاروق امتیاز کے ساتھ تجوری والے کمرے میں داخل ہوئے۔ امتیاز نے تجوری کے پچھلے حصے میں ہاتھ ڈال کر دو سوئچ آف کر دیے۔ اسی وقت سہیل کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں چابیوں کا ایک گچھا تھا۔ اس نے پہلے ایک چابی تجوری میں لگائی، پھر دوسری اور پھر تجوری کے ہینڈل پر لگا ایک خفیہ بٹن دبایا۔ دوسرے ہی لمحے دروازہ کھل گیا۔

"اب تم دونوں پیچھے ہٹ جاؤ۔ معائنہ ہم اپنے طور پر کریں گے۔ اس کی تمام ذمہ داری ہم پر ہوگی۔"

"ٹھیک ہے۔" دونوں ایک ساتھ بولے اور پیچھے ہٹ گئے۔ دونوں

نے جلدی جلدی تجوری کا جائزہ لیا۔ ایک دراز کھولتے ہی ان کا دل دھڑک اٹھا۔ باس کی معلومات کس قدر درست تھیں۔ اندر ایک گھونگھے نما ڈبیا رکھی تھی۔ محمود نے پلک جھپکتے ہی ڈبیا اٹھا کر جیب میں منتقل کر لی۔ تھوڑی دیر تک وہ جھوٹ موٹ کا جائزہ لیتے رہے اور پھر پیچھے ہٹتے ہوئے محمود نے کہا:

''خدا شکر ہے، اس میں کوئی ایسی خفیہ چیز نہیں ہے، جس کے لیے ہم فکر مند ہوں۔''

''لیکن وہ لوگ نقدی اور زیورات کے چور بھی تو ہو سکتے ہیں۔''

''ہاں، اس کا بھی امکان ہے، لیکن ہمیں نقدی اور زیورات کا اتنا فکر نہیں ہے، جتنا کہ اہم دستاویز وغیرہ کا۔ بہر حال اب فکر کی کوئی ضرورت نہیں۔ ویسے تم پہرے داروں کو چوکس رہنے کی ہدایت دے سکتے ہو اور الارم سوئچ بھی آن کر دو۔''

''ٹھیک ہے، تم فکر نہ کرو۔''

اور وہ ان سے رخصت ہو کر باہر نکل آئے۔ سڑک پر آتے ہی ان کی نظر دوسری طرف کھڑی ایک ٹیکسی پر پڑی۔ اس کا ڈرائیور بونٹ اٹھائے انجن پر جھکا ہوا تھا۔

''اگر یہ ٹیکسی خراب نہیں ہے تو اس کے ذریعے کیوں نہ چلیں۔'' محمود نے سرگوشی کی۔

''وہ تو ٹھیک ہے، لیکن تم نے سوچا کیا ہے۔ کیا یہ ڈبیا واقعی البرٹ جان کے حوالے کرنے کا ارادہ ہے۔''

''ارادہ تو ہرگز نہیں ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ ہم کریں بھی کیا۔ امی جان اور فرزانہ کی زندگیاں کس طرح بچائیں۔ اس کم بخت باس نے تو بہت

گہرا جال بچھایا ہے۔'' محمود بے چارگی کے عالم میں بولا۔

''میں یہ سوچ رہا ہوں کہ ٹیکسی میں بیٹھ کر کیوں نہ اس ڈبیا کو کھول کر دیکھا جائے۔ اس میں جو کچھ بھی موجود ہے، اگر ہم وہ نکال کر خالی ڈبیا البرٹ جان کے حوالے کر دیں تو کیا خیال ہے۔'' فاروق نے تجویز پیش کی۔

''صاف ظاہر ہے کہ اسے کھول کر اپنا اطمینان کرلے گا۔''

''ہوں، معاملہ بڑا ٹیڑھا ہے۔ کاش ہمیں معلوم ہوتا، ابا جان اس وقت کہاں ہیں۔ ہم یہ سارا معاملہ ان کے حوالے کر دیتے۔ وہ ضرور کوئی چال چل کر دشمن کی چال کو ناکام بنا سکتے تھے۔'' فاروق کے لہجے میں مایوسی کی جھلک صاف محسوس ہوئی۔

''ہمت ہارنے کی ضرورت نہیں، عقل سے کام لینے کی ضرورت ہے۔'' محمود نے کہا اور سوچ میں گم ہو گیا۔ پھر سڑک پر دونوں طرف دیکھتے ہوئے اس نے پریشانی کے عالم میں کہا۔

''فاروق، یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ یہ ٹیکسی ڈرائیور دراصل اس باس کا آدمی ہو۔''

''اوہ ہاں، اس کا امکان ہے اور اگر یہ شخص باس کا آدمی ہے تو ہمارے لیے کچھ بھی کرنے کا امکان نہیں، کیونکہ ادھر اسے کوئی شک ہوا، ادھر اس نے باس کو فون کیا اور پھر امی جان اور فرزانہ......'' فاروق نے جملہ درمیان میں چھوڑ دیا۔

''آؤ، دیکھا جائے گا۔'' محمود نے اچانک کہا اور ٹیکسی کی طرف قدم بڑھا دیے۔ فاروق بوکھلا اٹھا، لیکن اب وہ محمود کو روک نہیں سکتا تھا۔ ناچار

وہ بھی اس کے پیچھے چل پڑا۔

''کیوں جناب، ٹیکسی میں کوئی لمبی خرابی ہے۔'' محمود نے نزدیک پہنچ کر کہا۔

''نہیں تو، بس ہلکی سی آواز دے رہا تھا انجن۔ میرے خیال میں اب وہ بھی نہیں دے گا۔''

''تو پھر چلیے، ہمیں ہوٹل زوالو جانا ہے۔''

''تشریف رکھیے۔'' ڈرائیور نے کہا اور بونٹ بند کرتے ہوئے ان کے لیے دروازہ کھول دیا۔ دونوں پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ ڈرائیور نے اپنی سیٹ پر بیٹھ کر انجن اسٹارٹ کیا اور ٹیکسی روانہ ہو گئی۔ محمود نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ڈبیا نکال لی۔ انہوں نے گھونگھے نما ڈبیا زندگی میں پہلی بار دیکھی تھی۔ یہ سرخ رنگ کی تھی اور اس میں ٹانگیں بھی لگی ہوئی تھیں۔ اس نے اسے کھولنے کی کوشش کی، لیکن ڈبیا نہ کھلی۔ چند منٹ کی کوشش کے بعد اس نے ڈبیا فاروق کو دے دی اور اشارا کیا۔

''تم کھولنے کی کوشش کرنا ذرا۔''

فاروق نے بھی اپنی سی کوشش کر ڈالی، لیکن ڈبیا کو نہ کھلنا تھا نہ کھلی۔ اب تو دونوں بے حد پریشان ہوئے۔ حالات ہر لمحے نازک سے نازک تر ہوتے جا رہے تھے۔

''کیا کیا جائے۔'' فاروق نے سرسری لہجے میں کہا تاکہ ڈرائیور ان کی باتوں کی طرف توجہ نہ دے۔

''میں خود پریشان ہوں۔ یہ تو ہم نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ یہ ڈبیا کھل نہیں سکے گی، یہ تو سارا پروگرام ہی چوپٹ ہو گیا۔'' محمود نے کہا۔

''کاش ہمیں معلوم ہوتا۔ ابا جان اس وقت کہاں ہوں گے۔''

''کیا معاملہ ہے دوستو۔ کیا تمہارے ابا جان گم ہو گئے ہیں۔'' ڈرائیور کی آواز نے انہیں چونکا دیا۔ آواز انہیں جانی پہچانی سی لگی تھی۔

''نہیں، گم تو ہم ہو گئے تھے، وہ بے چارے تو ہمیں تلاش کرتے پھر رہے ہوں گے۔''

''اور تم یہ کس ڈبیا کی بات کر رہے تھے؟''

''آپس کی بات تھی بھائی۔ ہے ایک ہماری خاندانی ڈبیا۔'' فاروق نے جھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''خاندانی ڈبیا۔'' ڈرائیور کے منہ سے نکلا: ''خاندانی ہار، خاندانی ہیرا وغیرہ تو سنا تھا، یہ خاندانی ڈبیا پہلی مرتبہ سن رہا ہوں۔'' ڈرائیور نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

''چلو کوئی بات نہیں۔ پہلی مرتبہ کوئی بات سننا کوئی بری بات تو نہیں ہوتی۔'' فاروق نے بھی فوراً کہا۔ دونوں اس دوران برابر ڈبیا کو کھولنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ دراصل انہوں نے سوچا یہ تھا کہ ڈبیا میں جو کچھ ہے، نکالیں گے اور خالی ڈبیا البرٹ جان کے حوالے کر دیں گے، لیکن انہیں معلوم نہیں تھا کہ ڈبیا ان سے کھلے گی ہی نہیں۔

''لائیے ڈبیا میں کھولے دیتا ہوں۔ بہت تجربہ ہے مجھے۔ میں نے بڑی بڑی ڈبیا کھول دی ہیں۔'' ڈرائیور نے ایک ہاتھ پیچھے کی طرف لاتے ہوئے کہا۔ دوسرا ہاتھ بدستور سٹیرنگ پر جما ہوا تھا۔

''گاڑی چلاتے ہوئے تم کس طرح ڈبیا کھول سکو گے۔ پہلے سڑک کے کنارے گاڑی روک لو، پھر ڈبیا کھولنے کی کوشش کرو۔'' محمود بولا۔

''اس نے سوچا تھا کہ شاید ڈرائیور کے ہاتھ سے ہی ڈبیا کھل جائے اور ان کی مشکل آسان ہو جائے۔ بری طرح پھنسے ہوئے تو وہ تھے ہی۔

ڈرائیور نے گاڑی سڑک کے کنارے کرتے ہوئے روک دی۔ محمود نے فاروق کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''کیا خیال ہے، ڈبیا اسے کھولنے کے لیے دے دوں۔'' اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں پوچھا۔

''ٹھیک ہے، ہم اب اور کر بھی کیا سکتے ہیں۔ یہ تو کسی طرح کھل ہی نہیں رہی۔ اگر اس شخص نے کوئی گڑبڑ کی تو ہم اس سے سمجھ لیں گے۔'' فاروق نے بھی اشاروں میں جواب دیا۔

ڈبیا ڈرائیور کی طرف بڑھاتے ہوئے محمود کا ہاتھ کانپا۔ پل بھر کے لیے اسے خیال آیا، کہیں میں کوئی زبردست غلطی تو نہیں کر رہا ہوں۔ اسے یہ بھی یاد آیا کہ ٹیکسی ڈرائیور پہلے سے ہی سڑک پر کھڑا تھا اور ٹیکسی پر اس طرح جھکا ہوا تھا جیسے اس میں کوئی خرابی ہو گئی ہو۔ اس نے یکدم ہاتھ کھینچ لیا اور بولا:

''شکریہ جناب، ہم خود ہی کھول لیں گے، ایسی کون سی بات ہے۔''

''بھئی گھبرائیں نہیں، میں بہت ایماندار آدمی واقع ہوا ہوں۔'' ڈرائیور کی آواز میں ہنسی شامل تھی۔ دونوں چونکے۔

''کیا تم ہمارا مذاق اڑانے کے موڈ میں ہو دوست۔'' فاروق نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ارے نہیں بھئی، میں دوسروں کا مذاق اڑانے کا عادی نہیں۔ میرے پاس اتنا وقت ہی نہیں ہوتا کہ میں کسی کا مذاق اڑا سکوں۔'' اس نے پر اخلاق لہجے میں کہا۔

''تو پھر آپ مہربانی فرما کر ہمیں ہوٹل زوالو پہنچا دیں۔ ڈبیا کا مسئلہ ہم خود ہی حل کر لیں گے۔''

''جیسے آپ کی مرضی۔'' ڈرائیور نے بھی اکتا کر کہا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔

''یار فاروق، اس ڈرائیور کی آواز کچھ جانی پہچانی سی لگتی ہے۔'' محمود نے سرگوشی کی۔

''ہو سکتا ہے، ہم نے پہلے بھی کبھی اس کی ٹیکسی میں سفر کیا ہو اور سفر کے دوران اس سے باتیں بھی کی ہوں۔'' فاروق بولا۔

''لیکن میرا خیال ہے کہ یہ بات نہیں ہے۔''

''تو پھر کیا بات ہے؟''

''یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم کہ کیا بات ہے۔''

''آپ یہ کھسر پھسر کیا کرنے لگے۔ کہیں میرے خلاف کوئی سازش تو نہیں کر رہے۔''

''بھلا ہم آپ کے خلاف کیا سازش کریں گے۔'' فاروق نے بھنا کر کہا۔

''میری گاڑی ہتھیانے کی کوشش تو کر ہی سکتے ہیں۔'' ڈرائیور بولا۔

''دیکھو میاں، ہم لٹیرے نہیں ہیں۔ شریف انسان ہیں۔''

''یہ سن کر بہت خوشی ہوئی۔ لیجیے ہوٹل زوالو آ گیا۔''

ڈرائیور کی آواز سن کر انہوں نے چونک کر نظریں اٹھائیں۔ یہ ہوٹل کسی غیر ملکی کا تھا۔ بہت بڑا اور شاندار۔ وہ ٹیکسی سے اترے۔ بل ادا کیا اور ہوٹل کی طرف چلے۔

''ہم بہت بڑی مصیبت میں پھنس چکے ہیں۔ ڈبیا ہم اس شخص کے حوالے کر نہیں سکتے۔ ڈبیا اس کے حوالے نہ کریں تو امی جان اور فرزانہ کی زندگیاں خطرے میں پڑ جاتی ہیں۔ ڈبیا ہم سے کھل نہیں رہی کہ اس میں جو کچھ ہے اسے نکال کر خالی ڈبیا البرٹ جان کے حوالے کر دیں۔ ان حالات میں ہم کیا کریں۔'' فاروق نے بوکھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ہم یہ کر سکتے ہیں کہ تم ہال میں جا کر بیٹھو۔ میں فون بوتھ میں جا کر ابا جان کو ادھر ادھر تلاش کرتا ہوں۔ انکل اکرام کو بھی فون کروں گا۔ شاید وہ کہیں مل جائیں۔ ابھی ہمارے پاس کچھ وقت ہے۔ ڈبیا ہمیں بارہ بجے دینی ہے، کیا خیال ہے، اس ترکیب پر عمل کیا جائے۔'' محمود نے ہوٹل کے دروازے کی طرف قدم اٹھاتے ہوئے کہا۔

''یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ باس کا کوئی آدمی یہاں پہلے سے موجود ہو اور ہماری نگرانی کر رہا ہو۔'' فاروق بولا۔

''باس نے تو ہم پر کوئی پابندی عاید نہیں کی تھی۔ اس نے یہ بھی نہیں کہا تھا کہ ہم کسی کو فون نہیں کریں گے۔ یا اپنے ابا جان سے ملاقات نہیں کریں گے۔ اس نے تو صرف اتنا ہی کہا تھا کہ ڈبیا البرٹ جان کو پہنچا دی جائے اور جب البرٹ جان کا جہاز پرواز کر جائے گا اور اسے پرواز کیے دو گھنٹے گزر جائیں گے تو وہ ان دونوں کو آزاد کر دے گا۔''

''ٹھیک ہے تو پھر اس ترکیب پر عمل ضرور کرو۔ مشکل یہ ہے کہ ہم یہ ڈبیا جوں کی توں البرٹ جان کے حوالے کسی صورت نہیں کر سکتے۔'' فاروق نے کہا اور دروازے میں داخل ہونے کے بعد ہال کی طرف بڑھ گیا۔ محمود ٹیلی فون بوتھ کی طرف چلا گیا۔ اسی وقت ایک شخص اس کے بالکل پاس سے

گزرا۔ محمود کو ایک عجیب سا احساس ہوا۔ اس نے فوراً نظریں اٹھائیں۔ دوسرے ہی لمحے اس کی سٹی گم ہو گئی۔ ڈبیا جیب سے غائب تھی۔

☆☆☆

کہاں گئے؟

دروازہ کھلتے ہی دو آدمی اندر داخل ہوئے۔ چھت کے کنڈے سے لٹکنے والی رسی کو دیکھ کر ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ فرزانہ نے ابھی تک رسی دونوں ہاتھوں میں پکڑ رکھی تھی: البتہ اس کے پاؤں اب فرش پر تھے۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟''

''کہنے کو اسے ورزش بھی کہا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ روشن دان تک پہنچنے کی ایک کوشش ہے۔ امی جان لگائیے دھکا۔'' فرزانہ نے پرسکون انداز میں مسکرا کر کہا۔

''لیکن تم نے رسی اس کنڈے میں کیسے باندھ لی۔'' نگران کے لہجے میں بلا کی حیرت تھی۔ اس کا ساتھی بھی کبھی رسی کو اور کبھی انہیں گھور رہا تھا۔

''ایسے کام ہم کر ہی لیا کرتے ہیں۔ اپنے باس سے جا کر پوچھنا کہ ہم نے رسی کنڈے میں کیسے باندھ لی۔ وہ ہمارے بارے میں سب کچھ جانتا ہے۔''

''ہاں، ہم یہی کریں گے۔ اس نے ہمیں یہی دیکھنے کے لیے بھیجا تھا کہ تم لوگ کیا کر رہے ہو۔'' ایک بولا۔

''بس تو پھر تم دیکھ ہی چکے ہو کہ ہم کیا کر رہے ہیں، جا کر اپنے باس کو

اطلاع دے دو۔'' فرزانہ نے لاپروائی سے کہا۔

وہ واپس مڑ گئے۔ اس کے ساتھ ہی فرزانہ نے جھولا لیا۔ انہوں نے مڑ کر دیکھا۔ ایک نے ہنس کر کہا۔

''اس طرح تو تم ضرور روشندان تک پہنچ جاؤ گی۔''

''کوشش کر دیکھنے میں کیا حرج ہے۔''

دونوں نے باہر نکل کر دروازہ بند کیا اور باس کے کمرے میں آئے۔

''کیا کر رہے تھے وہ دونوں۔''

''انہوں نے ایک پلنگ کی رسی چھت کے کنڈے میں پھنسا لی ہے اور اب وہ لڑکی رسی پر جھول رہی ہے، اس طرح وہ اس روشندان تک پہنچنا چاہتی ہے جو باہر کی طرف کھلتا ہے۔''

''وہ ایسا نہیں کر سکے گی۔ جہاں تک کنڈے میں رسی پھنسا لینے کا تعلق ہے، اس کی ان سے مجھے پہلے ہی امید تھی۔''

''اب ہمارے لیے کیا حکم ہے؟''

''تالے کے سوراخ پر نظریں جما دو اور دیکھتے رہو، وہ اس ترکیب پر عمل کر کے کہاں تک پہنچتی ہے۔ ادھر دونوں لڑکے ڈبیا حاصل کر کے ہوٹل میں پہنچ چکے ہیں۔ لاری نے ہوٹل کے ہال سے یہی اطلاع دی ہے: تاہم ابھی انہوں نے اوپر کا رخ نہیں کیا۔ شاید اس سے پہلے وہ ابا جان کو فون کر کے حالات سے باخبر کرنا چاہتے ہیں، لیکن اول تو انسپکٹر جمشید انہیں ملے گا نہیں۔ اگر مل بھی گیا تو ان کی کوئی مدد نہیں کر سکے گا۔ اب یا تو بیگم جمشید اور فرزانہ سے ہاتھ دھو لیں گے یا ڈبیا البرٹ جان کے حوالے کر دیں گے۔ ہم اپنے معاہدے میں دونوں صورتوں میں پورے اتریں گے۔ ہم نے یہ گارنٹی تو لی ہی نہیں کہ ڈبیا ضرور ہی

البرٹ کے حوالے کر دی جائے گی۔ گارنٹی یہ ہے کہ یا تو ڈبیا البرٹ جان کے حوالے کی جائے گی یا پھر بیگم جمشید اور فرزانہ کی لاشیں شہر کی سڑک پر پڑی ملیں گی۔ ان دو باتوں میں سے ایک بات ہو کر رہے گی۔'' باس کہتا چلا گیا۔

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ ایک نگران اندر داخل ہوا اور اس نے اطلاع دی:

''باس گاہک آئے ہیں۔''

''ٹھیک ہے، انھیں یہیں لے آؤ۔'' اس نے کہا۔

جلد ہی ایک پتلا دبلا، لیکن خوش شکل آدمی اندر داخل ہوا۔ اس نے تیزی سے آگے بڑھتے ہوئے باس سے ہاتھ ملائے۔

''کیا رپورٹ ہے، مسٹر باس۔''

''اس وقت تک کام منصوبے کے عین مطابق جاری ہے۔ محمود اور فاروق ڈبیا لے کر ہوٹل کے ہال میں داخل ہو چکے ہیں۔ محمود فون پر انسپکٹر جمشید کی تلاش میں ہے۔''

''میں چاہتا ہوں، ان کی ملاقات آپس میں نہ ہونے پائے۔''

''ہم انسپکٹر جمشید کو کھو چکے ہیں۔ اس وقت وہ معلوم نہیں کہاں ہیں۔ آپ نے میری تجویز سے اتفاق نہیں کیا، ورنہ اس وقت وہ بھی یہاں قید ہوتے اور محمود اور فاروق کے لیے اس [illegible] بجائے تین زندگی بچانے کا مسئلہ ہوتا۔''

''اس سے میرا مطلب صرف یہ تھا کہ وہ بری طرح ناکام ہو جائے۔ اس کے آزاد ہوتے ہوئے اگر اس کے لڑکے ڈبیا ہمارے حوالے کریں گے تو یہ زیادہ مزیدار بات ہوگی۔ لوگوں کو باتیں بنانے کا خوب موقع ملے گا، بلکہ یہ

تک کہا جائے گا کہ اس نے جان بوجھ کر ڈبیا البرٹ جان کے حوالے کرنے کی ہدایت کر دی۔ تاکہ اپنی بیگم اور بچی کی جان بچا لے۔''

''ہاں، بات تو خیر آپ کی بھی ٹھیک ہے۔ خیر دیکھا جائے گا، کیا ہوتا ہے۔ نقصان میں تو دونوں طرح انسپکٹر جمشید کا گھرانا ہی رہے گا۔''

باس نے کہا۔ اسی وقت فون کی گھنٹی بجی اور وہ چونک اٹھے۔ باس کا ہاتھ ریسیور کی طرف بڑھ گیا۔

محمود آیا تو تھا فون کرنے، لیکن ڈبیا غائب ہوتے ہی حواس کھو بیٹھا۔ اس نے مڑ کر دیکھا، ٹیکسی ڈرائیور ایک کرسی پر بیٹھ رہا تھا۔ یہ دیکھ کر اس کی جان میں کچھ جان آئی۔ اس نے جلدی جلدی ادھر ادھر فون کیے، لیکن کہیں سے بھی اس کے والد کا سراغ نہ لگ سکا۔ آخر تھک ہار کر وہ باہر نکلا اور ہال کی طرف بڑھنے لگا۔ میز پر بیٹھتے ہوئے اس نے فاروق سے کہا۔

''یار فاروق، وہ ڈبیا۔ دیکھو چیخ نہ پڑنا۔ ہاں تو وہ ڈبیا میری جیب سے نکال لی گئی ہے۔''

''نہیں۔'' فاروق کے منہ سے دبی آواز میں کہا۔

''ہاں اور جہاں تک میرا خیال ہے، ڈبیا اس ڈرائیور نے نکالی ہے جس کی ٹیکسی میں ہم یہاں آئے ہیں۔''

''اوہ۔'' فاروق بولا، پھر اس نے ہال پر نظریں دوڑائیں۔ ڈرائیور اسے نظر آ گیا۔ اس نے فوراً کہا:

''تو پھر آؤ، چل کر اس سے بات کریں۔ اسے بتائیں کہ ڈبیا ہمارے لیے کس قدر اہم ہے۔''

''ٹھیک ہے، اب یہی کرنا ہوگا۔'' محمود نے کہا اور دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ ڈرائیور والی میز پر پہنچ کر محمود نے کہا۔

''کیا ہم یہاں بیٹھ سکتے ہیں جناب؟''

''ڈبیا کی تلاش میں آئے ہو۔'' ڈرائیور بولا۔

''جی ہاں، یہ ڈبیا ہمارے لیے زندگی اور موت کی ڈبیا ہے۔''

''حیرت ہے، تم ایک گھونگھے کو ڈبیا کہہ رہے ہو۔'' ڈرائیور نے مسکرا کر کہا۔

''وہ گھونگھے نما ڈبیا ہے۔''

''آخر اس میں کیا ہے۔ تم اس کے لیے اتنے پریشان کیوں ہو؟''

''افسوس، ہم اس کے بارے میں آپ کو کچھ نہیں بتا سکتے۔ یہ ایک راز ہے۔'' محمود نے کہا۔

''اگر تم نہیں بتاؤ گے، تو میں ڈبیا تمہارے حوالے نہیں کروں گا۔'' ڈرائیور بھی اڑ گیا۔

''وہ بھئی، آپ عجیب ڈرائیور ہیں۔'' محمود نے بھنا کر کہا۔

''ہاں، یہ بات ٹھیک ہے۔''

''کیا ٹھیک ہے؟''

''یہی کہ میں عجیب ڈرائیور ہوں۔ کچھ اور لوگوں کا بھی میرے بارے میں یہی خیال ہے کہ میں عجیب آدمی ہوں۔''

''دیکھو میاں، اس ڈبیا کے ذریعے ہم اپنی والدہ اور چھوٹی بہن کی جانیں بچا سکتے ہیں۔ اگر تم نے ڈبیا ہمارے حوالے نہ کی تو ان دونوں کو ہلاک کر دیا جائے گا۔''

''میرا بھی کچھ ایسا ہی خیال تھا۔ اب تم جلدی جلدی ساری بات بتا دو۔ وقت ضائع کرنے کی قطعاً کوشش نہ کرنا۔''

محمود اور فاروق زور سے چونکے، پھر فوراً ہی انہوں نے حیرت کے آثار کو چھپا لیا۔ ڈرائیور کی آواز اس مرتبہ بالکل بدل گئی تھی۔ پھر بھلا محمود اور فاروق اپنے والد کی آواز کو کیوں نہ پہچان لیتے۔

''اف خدا، تو یہ آپ ہیں۔'' محمود نے دبی آواز میں کہا۔

''ہاں، میں شہر کی خاک چھان رہا تھا کہ میں نے تمہیں ایک کار میں رحیم روڈ کی طرف سفر کرتے دیکھا۔ میں بھی تمہارے تعاقب میں لگ گیا۔ اس وقت میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے تمہیں آئی جی صاحب کی کوٹھی کے سامنے اترتے اور پھر اندر جاتے دیکھا۔ میں بھی کچھ آگے جا کر جیپ سے اترا اور پیدل واپس پلٹا، تم کوٹھی میں داخل ہو چکے تھے۔ میں نے پہریداروں کی نظر بچا کر اندر داخل ہونے کی کوشش کی، لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ آخر باہر ٹھہر کو ہی تم دونوں کا انتظار کرنے کا فیصلہ کیا۔ ایک میڈیکل سٹور سے اکرام کو فون کیا۔ اسے ایک ٹیکسی رحیم روڈ پر لانے کے لیے کہا۔ اپنا ریڈی میڈ میک اپ جیب سے نکال کر حلیہ تبدیل کیا، لیکن میں جانتا تھا کہ تم اس میک اپ میں مجھے پہچان لو گے۔ لہٰذا منہ کو ذرا ٹیڑھا کرنا پڑا۔ تم کوٹھی سے نکل کر میرے قریب آئے تو میں نے چہرہ سامنے کیے بغیر تم سے بات کی، پھر تمہیں لے کر ہوٹل کی طرف روانہ ہو گیا۔ راستے میں تم ڈبیا کھلوانے کے لیے میرے حوالے کرتے کرتے رہ گئے، لیکن ہال میں داخل ہوتے ہی میں نے تمہاری جیب پر ہاتھ صاف کر ہی دیا۔ اب تم مختصر ترین الفاظ میں بیان کر جاؤ کہ یہ سارا معاملہ کیا ہے، تمہاری امی جان اور فرزانہ کہاں ہیں؟''

''جی ابھی بتاتا ہوں، میں تو فون پر آپ سے ہی بات کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔'' یہ کہہ کر محمود نے اس وقت تک کے حالات کہہ سنائے۔ اس نے واقعات مختصر کر کے ضرور سنائے، لیکن کوئی ضروری تفصیل نہیں چھوڑی تھی۔ ساری کہانی سننے کے بعد انسپکٹر جمشید چند لمحے تک خاموش رہے، پھر بولے:

''یہاں باس کا کوئی آدمی ضرور موجود ہوگا۔ اس نے میری اور تمہاری ملاقات بھی دیکھ لی ہوگی۔ وہ باس کو اطلاع بھی کرے گا، خیر، پہلے تو میں غسل خانے میں جا کر اس ڈبیا کو کھولنے کی کوشش کرتا ہوں، اگر کامیاب ہو گیا تو ٹھیک، ورنہ پھر اسی طرح ڈبیا البرٹ جان کے حوالے کر دینا۔''

''یہ، یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟''

''ہم اس کے سوا اور کر ہی کیا سکتے ہیں۔ ایک ڈبیا کی خاطر ہم فرزانہ اور تمہاری امی کی زندگیاں قربان نہیں کر سکتے، لہٰذا ڈبیا اس کے حوالے کر دیں گے۔''

''لیکن ابا جان، کیا خبر اس ڈبیا میں کس قدر اہم چیز ہو۔''

''ہاں، میں جانتا ہوں، وہ کوئی بہت ہی خاص چیز ہوگی، جس کے لیے اتنا لمبا چکر چلایا گیا ہے، لیکن ہم کر ہی کیا سکتے ہیں۔'' انسپکٹر جمشید سوچ کے انداز میں بولے:

''اگر آئی جی صاحب اس وقت شہر میں موجود ہوتے تو ہم ان سے مشورہ کر سکتے تھے، لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ فوری طور پر ان سے رابطہ بھی قائم نہیں کیا جا سکتا۔''

''جیسے آپ کی مرضی، خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آپ ہمیں مل گئے، ورنہ ہماری تو جان پر بنی ہوئی تھی۔''

''چھوڑو، فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے لیے سب سے ضروری کام ان دونوں کی جانیں بچانے کا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور غسل خانے کی طرف چلے گئے۔ واپس لوٹے تو ان کے چہرے پر مایوسی کی جھلک تھی۔ نزدیک آ کر انہوں نے کہا:

''ڈبیا نہیں کھل سکی۔ اس کے کھولنے کا کوئی خاص طریقہ ہوگا۔ تم اوپر جاؤ اور ڈبیا البرٹ جان کے حوالے کر دو۔''

''کیا آپ اچھی طرح سوچ چکے ہیں ابا جان۔''

''ہاں بھئی، ہم اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتے۔''

''لل۔ لیکن۔ ابا جان۔'' فاروق ہکلایا۔

''ہاں ہاں، میں جانتا ہوں۔ مجھے ملازمت سے نکالا جا سکتا ہے۔ شاید سزا بھی سنا دی جائے، لیکن میں فرزانہ اور بیگم کو موت کے حوالے کس طرح کر دوں، جب کہ مجھے یہ معلوم بھی نہیں کہ ڈبیا میں ہے کیا۔''

''بہت بہتر، تو پھر ہم اوپر جاتے ہیں۔ ڈبیا ہمارے حوالے کر دیجیے۔'' محمود نے کہا۔

انسپکٹر جمشید نے میز کے نیچے سے ڈبیا محمود کے حوالے کر دی اور دونوں اٹھ کر لفٹ کی طرف چلے گئے۔ وہ وہیں بیٹھے رہ گئے۔ پھر اٹھے اور ہال سے باہر نکل آئے۔ وہ تھکے تھکے انداز میں قدم اٹھا رہے تھے۔

محمود اور فاروق نے کمرہ نمبر دو سو پندرہ کے دروازے پر پہنچ کر دستک دی۔ دروازہ فوراً ہی کھلا اور ایک غیر ملکی کا چہرہ نظر آیا۔ اس کی آنکھیں نیلی اور مونچھیں بڑی بڑی تھیں۔

''میں تم دونوں کا ہی انتظار کر رہا تھا۔ کیا تم ڈبیا لے آئے ہو۔''

''جی ہاں۔'' دونوں بولے۔

''بہت خوب، ڈبیا مجھے دے دو اور دروازے پرے سے ہی لوٹ جاؤ۔ میں دروازہ بند کر کے باس کے نمبر ڈائل کر کے اطلاع دوں گا کہ تم نے اپنا کام مکمل کر دیا ہے، لہٰذا جہاز روانہ ہونے کے ٹھیک دو گھنٹے بعد تمہاری والدہ اور بہن کو رہا کر دیا جائے۔''

''شکریہ جناب، یہ سب کچھ ہم نے انہی دونوں کے لیے کیا ہے۔'' محمود نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

البرٹ جان نے دروازہ بند کر لیا اور وہ دونوں واپس مڑ گئے۔

ہال میں پہنچے تو انہیں انسپکٹر جمشید کہیں نظر نہ آئے۔

''ارے ابا جان کہاں چلے گئے؟'' محمود کے منہ سے نکلا۔

☆☆☆

خوشگوار موڈ

محمود اور فاروق پریشانی کے عالم میں اپنے گھر کے صحن میں ٹہل رہے تھے۔ بیگم شیرازی، خان رحمان اور پروفیسر داؤد سب گھر والوں کے ساتھ یہاں موجود تھے۔ ان سب کی نظریں بار بار گھڑی کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ انسپکٹر جمشید کا کوئی پتا نہیں تھا۔ جہاز کو پرواز کیے دو گھنٹے گزر چکے تھے۔

''یہ ضروری بھی تو نہیں کہ باس نامی آدمی اپنا وعدہ بھی پورا کر دے۔'' خان رحمان نے پریشان آواز میں کہا۔

''ہم مجبور ہیں۔ اس کے وعدے کے مطابق انتظار کیے بغیر چارہ بھی تو نہیں۔'' پروفیسر داؤد نے کہا۔

''اگر وہ اپنے وعدے کا پکا ہے تو اس وقت تک وہ امی اور فرزانہ کو چھوڑ چکا ہو گا اور ان کے آنے میں آدھ گھنٹے سے زیادہ نہیں لگے گا۔'' محمود نے کہا۔

''خدا کرے ایسا ہی ہو۔'' بیگم شیرازی کے منہ سے نکلا۔

اور پھر ٹھیک پینتالیس منٹ بعد دروازے کی گھنٹی بجی۔ محمود اور فاروق اچھل کر بھاگے۔ دروازہ کھولا تو بیگم جمشید اور فرزانہ کھڑی تھیں۔

''امی جان۔'' ان دونوں کے منہ سے نکلا اور پھر وہ ان سے لپٹ گئے۔

ان سے فارغ ہو کر فرزانہ کو اپنے ساتھ چمٹا لیا۔

''بیٹا، پہلے ٹیکسی کا بل ادا کر دو۔ میری جیب میں تو بل ادا کرنے کے لیے پیسے بھی نہیں نکلے۔'' بیگم جمشید نے پرسکون انداز میں کہا اور اندر کی طرف بڑھ گئیں۔ فرزانہ نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ محمود اور فاروق ٹیکسی کا بل ادا کرنے کے لیے باہر نکل گئے۔

''ارے، ابا جان کہاں ہیں؟'' فرزانہ کے منہ سے نکلا۔

''ابھی محمود اور فاروق آ کر تمہیں تفصیل سے بتائیں گے۔''

اسی وقت محمود اور فاروق اندر داخل ہوئے۔ دروازہ بند کیا اور صحن میں آ گئے۔

''ہاں محمود، جلدی جلدی بتاؤ، تمہارے ساتھ کیا گزری؟''

محمود نے تفصیل سنا دی۔ بیگم جمشید اور فرزانہ دھک سے رہ گئیں۔

''تو تم نے وہ ڈبیا ان کے حوالے کر دی۔'' بیگم جمشید پھاڑ کھانے والے لہجے میں بولیں۔

''ہاں، ہم اس کے علاوہ اور کر ہی کیا سکتے تھے۔''

''تم نے بہت برا کیا۔ تمہیں ہم دونوں کی زندگیاں بچانے کے لیے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔''

''ہم کیا کر سکتے تھے۔ ابا جان کا مشورہ بھی یہی تھا۔''

''لیکن وہ خود کہاں ہیں؟'' وہ بولیں۔

''خدا ہی بہتر جانتا ہے، جب ہم ڈبیا البرٹ جان کے حوالے کر کے نیچے اترے تو وہاں سے غائب تھے۔''

''تب تو ہمیں یہ امید رکھنی چاہیئے کہ وہ ضرور کچھ نہ کچھ کر کے لوٹیں

گے۔'' فرزانہ نے خوش ہو کر کہا۔

''کیا کہا جا سکتا ہے۔ وہ گھنٹے گزر چکے ہیں۔ جہاز تو اب پڑوس ملک میں اتر بھی چکا ہوگا۔'' پروفیسر داؤد بولے۔

''انکل امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیئے۔'' محمود بولا۔

''اچھی بات ہے بھئی۔ اب نہیں چھوڑوں گا۔'' انہوں نے اداس انداز میں مسکرا کر کہا۔

وقت گزرتا رہا۔ شہناز بیگم ان لوگوں کے لیے چائے وغیرہ بنا کر لاتی رہیں۔ بیگم جمشید چونکہ قید سے آئی تھیں، لہٰذا انہیں آرام کرنے کا موقع دیا گیا تھا۔

''کم از کم ایک بات تو ہے۔ باس وعدے کا سچا نکلا۔'' محمود نے کہا۔

''ہاں، ورنہ وہ کام ہو جانے کے بعد ہم دونوں کو ہلاک کرنے کا حکم بھی دے سکتا تھا۔'' فرزانہ بولی۔

''اور مزے کی بات یہ کہ اسے بھی اس کام کا ٹھیکہ دیا گیا ہے یعنی اصل میں یہ کام لینے والا کوئی اور ہے۔ اب ہمیں اس کے علاوہ اس آدمی کو بھی تلاش کرنا ہے۔'' فاروق بولا۔

''باس کو ہی تلاش کرنا بہت مشکل کام ہے۔ اس اصل آدمی کو ہم کس طرح تلاش کر سکتے ہیں۔'' محمود نے بتایا۔

''دنیا میں کوئی کام مشکل نہیں۔ ذرا ٹیلی فون ڈائریکٹری میری طرف بڑھانا۔'' فرزانہ بولی۔

''کیوں، کیا ٹیلی فون ڈائریکٹری کے ذریعے باس اور اس آدمی کو تلاش کرو گی۔'' محمود نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''ہاں، لیکن صرف باس کو۔ اس آدمی کی باری بعد میں آئے گی۔ اگر باس گرفتار ہوگیا تو وہ آدمی تو خود بخود گرفتار ہو جائے گا۔'' فرزانہ مسکرائی۔

''سوال تو یہ ہے کہ تم ڈائریکٹری سے کس طرح اسے تلاش کرو گی۔ نہ تو ہمیں اس کا نام معلوم ہے اور نہ پتا۔ نہ فون نمبر۔'' فاروق نے جھلا کر کہا۔

''بس دیکھتے جاؤ۔''

''کیا دیکھتے جائیں، تمہارا سر۔'' محمود تلملا اٹھا۔

''چلو میرا سر ہی دیکھتے جاؤ، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔'' اس نے مسکرا کر کہا اور ڈائریکٹری کے ورق الٹنے لگی۔

''تم نے بتایا نہیں، تم اسے کس طرح تلاش کرو گی۔''

''عقل کے ذریعے۔ تم نے سنا نہیں۔ عقل بڑی یا بھینس۔''

''اوہ۔'' محمود کے منہ سے نکلا، پھر وہ گہری سوچ میں گم ہو گیا۔ آخر سر اٹھا کر بولا:

''تت۔ تو کیا تم۔ تم روشن دان سے۔''

''ہاں، تم ٹھیک سمجھے۔ میں روشندان سے باہر دیکھنے میں کامیاب ہو گئی تھی اور میں نے اس عمارت کے سامنے والی عمارت کے دروازے پر لگی نیم پلیٹ پڑھ لی تھی۔''

''اوہ۔'' ان میں سے کئی ایک کے منہ سے ایک ساتھ حیرت زدہ انداز میں نکلا اور اس وقت بیگم جمشید کو احساس ہوا کہ فرزانہ نے کتنا بڑا کام کر دکھایا تھا۔ اگر ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھی رہتی تو اس وقت ان کے لیے باس اور اس عمارت کو تلاش کرنا تقریباً ناممکن تھا، جس میں انہیں قید رکھا گیا تھا۔''

''نیم پلیٹ پر کیا نام لکھا تھا۔'' محمود نے پرجوش انداز میں کہا۔

''کیوں، اب تلاش کرنا ممکن نظر آنے لگا نا۔'' فرزانہ ہنسی۔

''فرزانہ، یہ بات تسلیم کرنا پڑتی ہے کہ تمہاری عقل کا جواب نہیں، لیکن تم اتنے اونچے روشن دان تک پہنچ کیسے گئیں۔'' محمود بولا:

اور فرزانہ نے ساری تفصیل کہہ سنائی۔ ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اس کے خاموش ہونے پر پروفیسر داؤد بولے:

''یہ تو تم نے بالکل ایسا کام دکھایا، جیسے سرکس والے دکھاتے ہیں۔''

''جی، جی ہاں۔ بس یہی سمجھ لیجئے۔''

''ارے، تم وہ نام گول کر گئیں۔'' فاروق نے اسے گھورا۔

''لیجئے اب نام بھی گول ہونے لگے۔'' فرزانہ بولی۔

''فرزانہ، اب بتاؤ بھی۔ زیادہ بے چین کرنے کا کیا فائدہ؟ جب ہم تین بیک وقت ڈائریکٹری پر نظریں دوڑائیں گے تو جلد اس آدمی کا نام تلاش کر لیں گے۔''

''تو پھر سنو، نیم پلیٹ پر میجر تنویر خان لکھا تھا۔''

''ویری گڈ۔'' فاروق کے منہ سے نکلا، لیکن پھر اس کے چہرے پر مایوسی جھلک اٹھی۔

''یہ ویری گڈ میں مایوسی کیوں شامل ہو گئی۔'' محمود نے حیران ہو کر کہا۔

''اس شہر میں تو نہ جانے کتنے میجر تنویر خان ہوں گے۔''

''تنویر خان تو ضرور بہت سے ہوں گے، میجر تنویر خان اتنے زیادہ نہیں ہو سکتے۔ ہمیں ڈائریکٹری میں جتنے میجر تنویر ملیں گے، نوٹ کرتے چلے جائیں گے۔''

انہوں نے ایم والے صفحات پر نظریں دوڑانا شروع کر دیں۔ اور پھر

انہیں جتنے بھی میجر تنویر خان ڈائریکٹری میں ملے وہ ان کے نام اور پتے نوٹ کرتے چلے گئے۔ اس کام میں کافی وقت لگ گیا۔

اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ سب کے سب اس طرح اچھلے جیسے زلزلہ آ گیا ہو، حالانکہ بات صرف اتنی تھی کہ انداز انسپکٹر جمشید کا تھا۔

پھر وہ سب دروازے کی طرف دوڑ پڑے۔ دروازہ کھلتے ہی انہوں نے انسپکٹر جمشید کو دیکھا۔ ان کے چہرے پر خوشگوار مسکراہٹ ناچ رہی تھی۔

☆☆

''اف ابا جان آپ کہاں چلے گئے تھے۔'' فرزانہ کے منہ سے نکلا۔

''تو تم دونوں کو اس نے چھوڑ دیا ہے۔'' انسپکٹر جمشید بولے۔

''جی ہاں، جہاز کو پرواز کیے جوں ہی دو گھنٹے ہوئے، اس نے ہمیں گاڑی میں روانہ کرا دیا۔ گاڑی ہمیں ایک سنسان سڑک پر چھوڑ گئی۔'' بیگم جمشید نے بتایا۔

''خدا کا شکر ہے۔'' یہ کہہ کر وہ اندر داخل ہوئے۔

''او ہو تو آپ سب لوگ بھی یہاں جمع ہیں۔'' انہوں نے سب کو دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

''اتنا بڑا واقعہ ہو جائے اور ہم یہاں جمع نہ ہوں۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے۔'' خان رحمان نے آنکھیں نکالیں۔

''واقعی یہ کسی طرح ممکن نہیں۔'' وہ بولے۔

''آخر وہ سب پھر اندر آ کر اطمینان سے بیٹھ گئے۔ انسپکٹر جمشید کو گرم گرم چائے پیش کی گئی۔ وہ بے چارے بھی تو پانچ بجے سے پریشان پھر رہے تھے۔

''مہربانی فرما کر جلد بتایئے، آپ کہاں سے آ رہے ہیں۔'' اور صورت

حال کیا ہے۔ آپ ہوٹل زوالو کے ہال سے کہاں غائب ہو گئے تھے۔''

''ہوٹل سے نکل کر میں نے اپنے لیے اس جہاز میں سفر کا انتظام کیا تھا، جس میں البرٹ جان کو سفر کرنا تھا۔ میں نے یہ انتظام بھی کیا کہ مجھے اس کے ساتھ والی سیٹ ملے۔ یہ انتظام کر کے میں ایک اور حلیے میں ہوٹل کی تیسری منزل پر پہنچا۔ تمہیں اس دروازے سے پلٹتے میں نے صاف دیکھا تھا۔ تم میرے قریب سے ہو کر نیچے چلے گئے تھے۔''

''اوہ۔'' ان کے منہ سے نکلا۔

''اور میں برآمدے کی غیر محسوس طور پر نگرانی کرتا رہا۔ پھر تیسری منزل پر کمرہ نمبر ۲۱۵ کا دروازہ کھلا۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور کمرے کا دروازہ بھی کھلا تھا، لیکن میں نے دوسرے آدمی کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی، کیونکہ مجھے تو اصل غرض کمرہ نمبر ۲۱۵ کے مسافر البرٹ جان سے تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا بریف کیس تھا۔ وہ نیچے اترا اور ٹیکسی میں روانہ ہو گیا۔ میں نے بھی پہلے ہی ٹیکسی کا انتظام کر رکھا تھا۔ میں اس میں بیٹھ کر اس کے تعاقب میں نکل گیا۔ ایئر پورٹ پر پہنچ کر اس نے کسی کو فون کیا اور پھر جہاز میں سوار ہو گیا۔ میں اس کے کافی دیر بعد جہاز پر سوار ہوا۔ آخر جہاز میں سوار ہو گیا۔ پھر جہاز نے پرواز کی۔ پرواز کے دوران میں نے اس سے بات چیت شروع کر دی۔ سگریٹ کے بہانے اس سے دو ایک بار لائٹر مانگا۔ اس کی جیبوں پر کئی بار ہاتھ صاف کیا۔ دو ایک بار اس بہانے باتھ روم تک بھی گیا۔ واپس آ کر سیٹ پر بیٹھتے وقت ٹھوکر بھی کھائی اور اس کی جیبوں کی پھر خبر لے آیا۔ لیکن نہ جانے اس نے ڈبیا کہاں چھپائی تھی۔ آخر میں نے اس کی باقاعدہ تلاشی کا پروگرام بنایا۔ ایک بار جب وہ باتھ روم میں گیا تو میں بھی اس کے تعاقب میں

گیا۔ جہاز کے عملے کو پہلے ہی میرے بارے میں ہدایت دے دی گئی تھیں؛ چنانچہ باتھ روم میں ایک غیر محسوس گیس چھوڑ کر اسے بے ہوش کر دیا گیا اور میں نے اس کی اچھی طرح تلاشی لی، لیکن ڈبیا اس کے پاس نہیں تھی دو گھنٹے بعد جب جہاز دوسرے ملک کی سرزمین پر اترا تو اس نے پھر فون کیا اور میں سمجھ گیا کہ اس نے اپنے خیریت سے پہنچنے کی اطلاع دے دی ہے بے ہوش ہونے کے بارے میں اس نے شاید سوچا بھی نہیں تھا۔ غالباً اس نے یہی سمجھا ہوگا کہ چکر آ گیا ہوگا۔ جوں ہی وہ فون کر کے باہر نکلا، میرے اشارے پر اسے جکڑ لیا گیا۔ اور واپس جہاز میں لے آئے۔ اس کا بریف کیس بھی کھولا گیا، لیکن ڈبیا اس میں بھی نہیں تھی۔ اب تو میں بہت حیران ہوا۔ آخر اس کے بریف کیس کو اکھاڑا گیا اور اس میں سے ڈبیا نکل آئی۔''

''ارے۔'' ان کے منہ سے نکلا۔

''ہاں، البرٹ جان کو گرفتار کر لیا گیا، ایک پرواز اس وقت ادھر آنے کے لیے بالکل تیار تھی۔ سو میں اس میں سوار ہو کر یہاں پہنچ گیا۔ میرے ساتھ ہی البرٹ جان کو لایا گیا ہے۔ اور اس وقت وہ حوالات میں ہے، لیکن زبان کھولنے پر تیار نہیں۔ اس کا کہنا یہ ہے کہ وہ اس ڈبیا کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ میں نے یہ بریف کیس کسی سے خریدا تھا۔ خیر، اس سے تو بات بعد میں کر لیں گے، مجھے تو ادھر کی بے چینی لگی تھی۔ سوچ رہا تھا کہ خدا جانے اس نے تم دونوں کو چھوڑا ہے یا نہیں۔''

''بھئی اس لحاظ سے وہ وعدے کا پکا نکلا۔'' خان رحمان نے خوش ہو کر کہا۔

''ہاں، کچھ برے لوگ بھی اپنے وعدوں اور اپنے اصولوں کا پاس

کرتے ہیں۔'' انسپکٹر جمشید بولے۔

''ابھی تک یہ بھی معلوم ہوا یا نہیں کہ اس ڈبیا میں کیا ہے؟'' پروفیسر داؤد بولے۔

''یہ بات تو آئی جی صاحب ہی آکر بتائیں گے۔ وہ صبح پہنچ رہے ہیں۔''

''تو کیا انہیں بھی اس واقعے کی خبر ہو چکی ہے؟''

''نہیں، اب رہ جاتا ہے اس باس کا مسئلہ۔ میں حیران ہوں کہ ہم اسے کس طرح تلاش کریں گے۔''

''لیکن ابا جان اس کی تلاش کا مسئلہ تو فرزانہ حل کر بھی چکی ہے۔'' فاروق چہکا۔

''کیا مطلب؟'' انہوں نے چونک کر کہا۔

اور جب تفصیل انہیں سنائی گئی تو وہ جوش سے بھر گئے۔ انہوں نے چلا کر کہا۔

''جیو فرزانہ، تمہارا جواب نہیں۔''

''اس کا مطلب ہے کہ میرا اور محمود کا جواب ہے۔'' فاروق نے منہ بنا کر کہا اور سب ہنس پڑے۔

''ہم وقت ضائع نہیں کریں گے۔ پہلے اس باس کو گرفتار کریں گے۔ اور پھر اصل آدمی کو جس نے یہ کام کرنے کا ٹھیکہ باس کو دیا ہے۔''

اس کے بعد وہ اس مہم پر نکل کھڑے ہوئے۔ اکرام اور دوسرے عملے کو خبردار کر دیا گیا جونہی ان کی طرف سے کوئی اطلاع ملے وہ روانہ ہو جائیں۔ اب انہیں باری باری میجر تنویر خان نام کے آدمیوں کی رہائش گاہوں

کے پاس سے گزرنا پڑا۔ فرزانہ کو وہ نیم پلیٹ اچھی طرح یاد تھی۔ آخر شہر کے درمیان ایک سڑک پر فرزانہ ایک نیم پلیٹ دیکھ کر چونک اٹھی۔ اس نے پرجوش انداز میں کہا:

''یہی وہ نیم پلیٹ ہے۔ ہم تقریباً اس کوٹھی کے سامنے والی عمارت میں قید تھے۔''

انہوں نے دوسری طرف دیکھا اور حیران رہ گئے۔ سامنے والی عمارت کی پیشانی پر لکھا تھا:''

''نیشنل ہسپتال۔''

☆☆☆

اُن کی تلاش

وہ اس عمارت پر سرسری نظر ڈالتے آگے بڑھ گئے۔ کچھ دور جا کر رکتے ہوئے انسپکٹر جمشید بولے:

''کیوں فرزانہ، کیا تمہیں پورا یقین ہے کہ یہی وہ نیم پلیٹ تھی۔''

''جی ہاں ابا جان۔'' اس نے کہا۔

''اس کا مطلب ہے، تم لوگ نیشنل ہسپتال میں لے جائے گئے تھے۔ اوہ، تمہیں لے جایا بھی تو ایک ہسپتال ویگن میں گیا تھا۔'' انہوں نے چونک کر کہا۔

''جی ہاں، یہ ٹھیک ہے۔ ہمیں لے جانے والے ہسپتال کی ایک ویگن لے کر آئے تھے اور ہسپتال کی وردی میں بھی تھے۔'' فرزانہ نے بتایا۔

''تب پھر ہم ٹھیک جگہ پہنچ چکے ہیں۔ شاید اسی لیے ان لوگوں نے یہ سب کام آزادانہ انداز میں کیا ہے۔ ظاہر ہے ہسپتالوں کی ویگنوں پر کون شک کرے گا کہ اس میں سچ مچ کسی مریض کو لے جایا جا رہا ہے یا کسی کو اغوا کر کے۔'' انہوں نے کہا اور وائرلیس پر اکرام کو اطلاع دینے لگے۔

ایک گھنٹے بعد ہسپتال کی عمارت کا پوری طرح محاصرہ کیا جا چکا تھا۔

انسپکٹر جمشید باقی لوگوں کے ساتھ اندر داخل ہو گئے۔ جو بھی نظر آیا، اسے گرفتار کر لیا گیا۔ ڈاکٹروں اور نرسوں نے اعتراض کیا کہ یہ سب کیا ہے۔ اس پر انہوں نے کہا۔

''اس ہسپتال کا انچارج کون ہے، میں اس اعتراض کا جواب اسے دوں گا۔''

''تو پھر پہلے جا کر اسی سے بات کیجئے نا، ہمیں کس جرم کی پاداش میں گرفتار کیا جا رہا ہے۔''

''اس کا کمرہ کون سا ہے۔ رہنمائی آپ لوگ کریں۔ گرفتار اسے ہم کریں گے۔''

''آئیے، یہ ایک پرائیوٹ ہسپتال ہے اور وہ اس ہسپتال کا مالک ہے۔'' ڈاکٹر نے کہا۔

''اس کا نام کیا ہے؟''

''سب لوگ اسے صرف باس کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔''

''ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے یہ ہسپتال جرائم پیشہ لوگوں کے لیے بنایا گیا ہو، جو یہاں آزادانہ اپنا علاج کرائیں اور پولیس سے صاف بچتے رہیں۔'' انسپکٹر جمشید بڑبڑائے۔ ڈاکٹر نے کوئی جواب نہ دیا۔

اب وہ برآمدے میں چل رہے تھے اور محمود، فاروق اور فرزانہ ان برآمدوں کو پہچان رہے تھے۔

''اب اس میں کوئی شک نہیں رہا کہ ہم اسی عمارت میں قید تھے۔'' فرزانہ پر یقین لہجے میں بولی۔

''چلو خدا کا شکر ہے کہ تمہیں کسی بات میں تو کوئی شک نہیں رہا۔''

فاروق نے لمبا لمبا سانس کھینچا۔

آخر خدا خدا کر کے وہ ایک کمرے کے سامنے رکے۔ محمود فاروق اور فرزانہ پر جوش کی کیفیت دیکھ کر انسپکٹر جمشید سمجھ گئے کہ باس کا کمرہ یہی ہے۔ انہوں نے دروازے پر دستک دی۔

پہلی دستک پر کوئی جواب نہ ملا۔ دوسری پر بھی خاموشی رہی آخر تیسری مرتبہ انسپکٹر جمشید نے دروازہ دھڑ دھڑا ڈالا۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے۔ کس کی موت نے اسے آواز دی ہے۔'' اندر سے دھاڑ کر کہا گیا۔ باہر سے کوئی کچھ نہ بولا۔

''بولتے کیوں نہیں، کون ہے، کیا قیامت ٹوٹ پڑی ہے اس وقت۔''

انسپکٹر جمشید کے اشارے پر باہر پھر بھی خاموشی رہی۔ آخر پہلے بھاری قدموں کی آواز سنائی دی اور پھر ایک جھٹکے سے دروازہ کھلا۔ انہوں نے ایک گوریلے نما آدمی کو دیکھا۔ دوسری طرف اس کی نظر انسپکٹر جمشید پر پڑی۔ ان کے ہاتھ میں سیاہ رنگ کا پستول تھا اور اس کی نالی کا رخ باس کی طرف۔

سب نے سنا، انسپکٹر جمشید پر سکون انداز میں کہہ رہے تھے:

''حیرت ہے، تم مجھ سے اور میرے بچوں سے بہت ہی اچھی طرح واقف ہو، پھر بھی گہری نیند سو رہے ہو؛ گویا تم نے یہ یقین کر لیا تھا کہ تم بازی جیت چکے ہو اور ہم مکمل طور پر ہار چکے ہیں، کیونکہ دوسرے ملک سے تمہیں البرٹ جان نے فون بھی کر دیا تھا کہ وہ ڈبیا سمیت بخوبی بخیریت ادھر اتر گیا، لہٰذا تم نے فرزانہ اور اس کی امی کو رہا کر دیا اور خود لمبی تان کر سو گئے۔ تم نے یہ کیوں نہ سوچا کہ ہم چین سے بیٹھنے والے آدمی نہیں اور اپنے ملک کے راز کسی قیمت پر دوسروں کو نہیں دیا کرتے۔ اب شاید تم اس بات پر

حیران ہو رہے ہو کہ ہم یہاں تک کس طرح پہنچ گئے۔ احمق انسان، یہ کارنامہ فرزانہ نے انجام دیا ہے۔ یہ اس روشن دان تک پہنچ گئی تھی اور اس نے روشندان میں سے جھانک لیا تھا۔ باہر اسے میجر تنویر خان کے نام کی تختی نظر آئی تھی۔ اب تم یہ سوچ سوچ کر حیران ہو رہے ہو کہ یہ روشندان تک کس طرح پہنچ گئی۔ جب کہ تمہارے خیال میں یہ ناممکن تھا؛ حالانکہ تمہیں یہ اطلاع بھی مل گئی ہو گی کہ انہوں نے مل کر چھت والے کنڈے میں رسی پھنسا لی تھی۔ اس کے بعد فرزانہ دونوں پلنگوں کو اوپر نیچے رکھ کر رسی کو کافی اونچائی سے پکڑ کر لٹک گئی تھی اور اس کی امی نے اسے پورے زور سے جھولا دینا شروع کر دیا تھا۔ تم نے شاید کبھی سرکس نہیں دیکھا، ورنہ یہ خیال نہ کرتے کہ روشن دان تک پہنچنا ناممکن ہے؛ تاہم میں تمہارے ساتھ اچھا سلوک کرنے پر خود کو مجبور پاتا ہوں، کیونکہ تم میں اتنی شرافت ضرور ہے کہ تم نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا اور ٹھیک وقت پر انہیں چھوڑ دیا۔ اکرام اسے گرفتار کر لو، لیکن اس پر کوئی سختی نہیں کی جائے گی۔ عدالت اسے جو سزا چاہے دے۔ ہماری طرف سے یہ نرمی کا حق دار ہو گا اور ہاں، لگے ہاتھوں یہ بھی بتا دو کہ تم نے یہ سب کام کس کے کہنے پر کیا ہے۔ میرا مطلب ہے، اس کام کا ٹھیکہ تمہیں کس نے دیا ہے۔''

''افسوس، میں اسے نہیں جانتا۔ بات چیت فون پر ہوئی تھی اور ادائیگی بذریعہ دستی پیکٹ کر دی گئی تھی۔ میں نے پیکٹ لانے والے کا تعاقب بھی نہیں کرایا تھا، کیونکہ اس نے فون پر منع کر دیا تھا۔'' اس نے کہا۔

''دیکھ لو، سوچ لو۔ اگر تم اس کا نام بتا دو گے تو میں بہت نرم سزا کی سفارش کروں گا۔''

''کہہ چکا ہوں کہ میں اس کا نام نہیں جانتا۔'' اس نے کندھے اچکائے۔

''خیر نہ بتاؤ، میں خود ہی اس کا نام معلوم کر لوں گا۔''

باس کو گرفتار کر لیا گیا۔ واپسی پر انسپکٹر جمشید بولے:

''تم تمام واقعات ایک بار پھر تفصیل سے سناؤ۔ میں ان کا بغور جائزہ لینا چاہتا ہوں۔''

''جی بہتر۔'' محمود نے کہا اور سیر سے لے کر گرفتاری تک کے واقعات تفصیل سے سنا دیے۔ اس کے بعد فرزانہ کی باری آئی۔ اس کے خاموش ہونے پر انہوں نے کہا:

''ٹھیک ہے۔ صبح پہلے ہم آئی جی صاحب سے ملاقات کریں گے۔ اس کے بعد اصل مجرم کو گرفتار کریں گے۔''

''جی، کیا آپ اسے پہچان گئے ہیں۔''

''ابھی نہیں، میں آئی جی صاحب سے پوچھوں گا کہ اس ڈبیا کے بارے میں کس کس شخص کو معلوم تھا۔ صاف ظاہر ہے کہ مجرم ان میں سے ہی کوئی ایک ہو سکتا ہے۔''

''ویری گڈ۔ لیکن ابا جان، ایسے تو کئی آدمی ہو سکتے ہیں، آپ ان میں سے مجرم کو کیسے پہچانیں گے۔''

''یہ بعد میں دیکھیں گے۔ پہلے ان سے ملاقات تو کر لیں۔''

''اس کا مطلب یہ ہے کہ اب صبح سے پہلے کچھ نہیں ہو سکتا۔''

''ہاں، یہی بات ہے۔ لیکن گھر میں آئے ہوئے مہمانوں کے ساتھ گپ شپ تو ہو ہی سکتی ہے۔'' وہ مسکرائے۔

دوسری صبح آئی جی صاحب حیرت بھرے انداز میں ان کی کہانی سن رہے تھے۔ کہانی کے آخر میں انہوں نے ڈبیا ان کے سامنے میز پر رکھتے ہوئے کہا:

''اب صرف اتنا بتا دیں کہ اس ڈبیا میں ہے کیا؟ یہ کھلتی کیسے ہے اور اس ڈبیا کے بارے میں اور کس کس کو علم ہے؟''

''یہ ڈبیا محکمہ داخلہ کے ذریعے مجھ تک پہنچی تھی۔ خانصاحب میرے اسسٹنٹ اور چپراسی کو بھی اس کے بارے میں معلوم ہے، لیکن اسسٹنٹ اور چپراسی کو یہ معلوم نہیں کہ اس میں ہے کیا۔ جب کہ خان صاحب کو معلوم ہے۔ محکمہ داخلہ کے بھی چند آفیسروں کو اس کے بارے میں ضرور معلوم ہوگا۔'' انہوں نے بتایا۔

''خان صاحب کی ذات تو شک و شبے سے بری ہے۔ آپ کے اسسٹنٹ کو بھی میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ چپراسی بھی بہت صاف آدمی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھے محکمہ داخلہ میں جا کر ہی تفتیش کرنا ہوگی۔ آپ ان لوگوں کے نام مجھے بتا دیں جنہیں اس ڈبیا کے بارے میں علم ہو سکتا ہے۔''

''ٹھیک ہے، تم اس سلسلے میں سرور رضائی سے جا کر مل لو، وہی بتا سکیں گے کہ ان کے علاوہ اور کس کس کو معلوم ہے۔''

''سرور رضائی۔'' محمود اور فاروق کے منہ سے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔

''ہاں، کیوں کیا بات ہے۔ کیا یہ نام تمہیں عجیب لگا ہے؟''

''عجیب نہیں۔ پراسرار۔'' محمود نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔

''پراسرار، وہ کیسے؟''

''وہ ایسے کہ یہی وہ شخص ہیں، جن کی کار میں ان دونوں کو لفٹ ملی تھی۔ انہوں نے بتایا کہ کسی عزیز کی عیادت کے لیے گئے تھے۔ آؤ بھی چلیں، ہم ان سے معلوم کر لیں گے۔'' انسپکٹر جمشید اٹھتے ہوئے بولے۔

''ارے ارے، اتنی بھی کیا جلدی ہے، بیٹھو بھی۔''

''نہیں سر، کہیں مجرم فرار نہ ہو جائے۔ میں ابھی تھوڑی دیر تک پھر حاضر ہوتا ہوں۔''

یہ کہہ کر وہ ان کے ساتھ باہر نکلے اور محکمہ داخلہ کے دفتر پہنچے۔ سرور رضائی کے کمرے میں داخل ہوتے ہی انسپکٹر جمشید بری طرح چونکے۔ ان کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔ ان کا دھک کرنے لگا۔

''رضائی صاحب، مجھے انسپکٹر جمشید کہتے ہیں اور یہ محمود، فاروق اور فرزانہ ہیں۔ میں ذرا علیحدگی میں آپ سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

''جی بہتر، آپ کو چند منٹ انتظار کرنا پڑے گا۔''

''کوئی بات نہیں۔''

''چند منٹ بعد وہ ایک بند کمرے میں آ کر بیٹھ چکے تھے۔

''اب فرمائیے، کیا معاملہ ہے؟''

''کل رات آپ نے میرے دو بچوں کو لفٹ دی تھی اور انہیں رحیم روڈ پر اتارا تھا۔ آپ کو یاد ہے نا؟''

''اوہ، تو وہ یہ تھے۔ رات کا وقت تھا۔ میں نے ان کے چہروں کو غور سے نہیں دیکھا تھا۔'' وہ بولے۔

''اور آپ نے انہیں بتایا تھا کہ آپ کے ایک عزیز بیمار تھے، آپ ان

کی عیادت کے لیے گئے تھے۔''

''جی، جی ہاں، یہ ٹھیک ہے۔''

''اس عزیز کا نام اور پتا بتایئے۔'' انسپکٹر جمشید عجیب سی آواز میں بولے۔

''جی۔'' سرور رضائی کے منہ سے نکلا۔

''میں نے کہا ہے، اس عزیز کا نام اور پتا بتایئے۔''

''لیکن کیوں، اس کی کیا ضرورت ہے؟''

''اس کی بہت ضرورت ہے، آپ نام اور پتا بتایئے۔''

''جب تک آپ یہ نہیں بتائیں گے کہ آپ یہ کس سلسلے میں پوچھ رہے ہیں، میں کچھ نہیں بتا سکتا۔''

''بہت اچھا۔'' یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید نے جیب سے اچانک پستول نکال لیا اور اسے سرور رضائی کی طرف تانتے ہوئے بولے:

''محمود، آئی جی صاحب کو فون کرو۔ ان سے کہو، ذرا جلدی یہاں تشریف لے آئیں۔''

''جی بہتر۔'' محمود نے کہا اور کمرے میں رکھے فون کا ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے لگا۔

''آخر یہ آپ کر کیا رہے ہیں؟ آپ نے مجھ پر پستول تان لیا ہے؟''

''ابھی پتا چل جاتا ہے۔''

''آپ کو میرے ہی دفتر میں مجھ پر پستول تاننے کا کوئی حق نہیں۔ میں ایک ذمے دار افسر ہوں۔ میرا عہدہ بھی آپ سے بڑا ہے۔ میں آپ کی رپورٹ کروں گا۔''

''ضرور کریں، لیکن آپ اس عزیز کا نام اور پتا کیوں نہیں بتا رہے۔''

''آپ کو بھی پہلے یہ بتانا ہوگا کہ آپ یہ سب کس لیے پوچھ رہے ہیں۔''

''اور یہ اپنے آئی جی صاحب کو کیوں بلا رہے ہیں۔''

''بات اگر ان کی موجودگی میں ہو تو زیادہ بہتر رہے گی۔'' وہ مسکرائے۔

''میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔'' اس نے جھنجلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''اب آئی جی صاحب کے آنے کے بعد ہی بات ہوگی۔ اس وقت تک آپ خاموش بیٹھے رہیں۔'' انسپکٹر جمشید نے برا سا منہ بنایا۔

''بہت اچھا، دیکھا جائے گا۔''

پانچ منٹ بعد ہی آئی جی صاحب وہاں پہنچ گئے۔ ان کے ساتھ ڈی آئی جی افتخار احمد خان صاحب بھی تھے۔ اکرام اور اس کے چند ماتحت بھی تھے۔

''ہاں جمشید، کیا معاملہ ہے؟''

''محمود اور فاروق نے کل رات نیشنل ہسپتال سے نکالے جانے کے بعد سنسان سڑک پر ان کی کار میں لفٹ لی تھی جناب، یہ بات آپ کو بھی معلوم ہے۔''

''ہاں، بہت اچھی طرح معلوم ہے۔ انہوں نے محمود اور فاروق کو بتایا تھا کہ ان کے ایک عزیز بیمار تھے اور یہ ان کی عیادت کے لیے دوسرے شہر گئے تھے۔'' انہوں نے کہا۔

''جی ہاں، اب میں ان سے ان کے بیمار عزیز کا نام اور پتا پوچھ رہا ہوں اور یہ کچھ بتانے کے لیے تیار نہیں ہیں۔''

''کیوں سرور رضائی صاحب۔''

''میں آپ کو جواب دہ نہیں ہوں، آخر پہلے مجھے ساری بات تفصیل سے کیوں نہیں بتائی جاتی؟''

''اکرام، قدوائی صاحب کو میرا سلام پہنچاؤ۔'' آئی جی صاحب بولے۔ قدوائی صاحب محکمہ داخلہ کے ڈائریکٹر تھے۔

''جی بہتر۔'' اکرام نے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔ سرور رضائی کا رنگ اڑ گیا۔

''یہ۔ یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟''

''آپ ہی نے تو کہا ہے کہ آپ مجھے جواب دہ نہیں ہیں؛ چنانچہ میں نے اس آدمی کو یہاں بلایا ہے، جسے آپ جواب دہ ہیں۔'' انہوں نے مسکرا کر کہا۔

جلد ہی ایک بھاری بھرکم آدمی اندر داخل ہوا۔ انہوں نے اندر کے منظر کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھا اور بولا:

''شیخ صاحب، یہ کیا چکر ہے؟''

''تشریف رکھیے۔ آپ کو سارا چکر بتانا پڑے گا۔''

''لیجیے، بیٹھ گیا۔ لیکن یہ انسپکٹر جمشید ہمارے آدمی پر پستول کیوں تانے ہوئے ہیں۔''

''ابھی تفصیل سے پتا چل جائے گا۔'' یہ کہہ کر آئی جی صاحب نے رات کے واقعات سنا دیے اور پھر بولے:

''اب انسپکٹر جمشید سرور رضائی صاحب سے صرف یہ سوال پوچھنا چاہتے ہیں کہ ان کے اس عزیز کا نام اور پتا کیا ہے۔ آخر یہ بتا دینے میں کیا حرج ہے۔''

''میرے خیال میں تو کوئی حرج نہیں۔'' قدوائی صاحب بولے۔

''لیکن کیا مجھ پر صرف اس لیے شک کیا جا رہا ہے کہ میں نے ان دونوں کو لفٹ دی تھی۔''

''شک کی کوئی تو کوئی بھی وجہ ہو سکتی ہے۔ اچھا چلیے، میں آپ سے ایک اور سوال کرتا ہوں۔ آپ ان دونوں کو رحیم روڈ پر اتار کر کہاں گئے تھے؟''

''کہاں، جاتا، گھر گیا تھا۔''

''کیا واقعی؟'' انسپکٹر جمشید نے آنکھیں نکالیں۔

''مجھے جھوٹ بولنے کی آخر کیا ضرورت ہے۔''

''بات تو یہ بھی ٹھیک ہے۔ اکرام ان کا بیان تو تم نوٹ کر ہی چکے ہو۔ مہربانی فرما کر فوراً ہوٹل زوالو پہنچ کر کمرہ نمبر ۲۱۵ کے بالکل سامنے والے کمرے پر قبضہ کر لو۔ اس کی میزوں اور کرسیوں یا برتنوں وغیرہ پر سے تمہیں سرور رضائی صاحب کی انگلیوں کے نشانات تلاش کرنا ہے، کیونکہ میں نے انہیں عین اس وقت اس کمرے سے نکلتے دیکھا تھا۔ جب کمرہ نمبر ۲۱۵ سے البرٹ جان نکلا تھا۔ اس وقت میں میک اپ میں تھا۔ دوسرے یہ کہ میں سرور رضائی کو پہچانتا بھی نہیں تھا۔ یہ تو مجھے یہاں آ کر پتا چلا کہ ہے کہ برآمدے میں کمرہ نمبر ۲۱۵ کے سامنے سے یہ نکلے تھے۔''

''اوہ۔'' محمود، فاروق اور فرزانہ کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

اس وقت انہیں معلوم ہوا کہ ان کے والد سرور رضائی کو دیکھ کر حیران کیوں ہوئے تھے۔

''ابھی ابھی یہ کہہ چکے ہیں کہ محمود اور فاروق کو اتار کر یہ گھر گئے تھے، لیکن ہوٹل کے کمرے سے ملنے والے انگلیوں کے نشانات ان کے اس بیان کو بھی جھٹلا دیں گے۔ انہوں نے ابھی تک یہ بھی نہیں بتایا کہ ان کا کونسا عزیز بیمار تھا اور اس کا پتا کیا ہے۔''

''تو کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ سرور رضائی ہی وہ شخص ہے، جس نے باس کی خدمات حاصل کی تھیں۔ دوسرے الفاظ میں یہ دشمن ملک کے جاسوس ہیں۔'' آئی جی صاحب کے لہجے میں حیرت تھی۔

''جی ہاں جناب، اس میں ایک فیصد بھی شک نہیں۔''

''یہ سراسر الزام ہے۔ میرا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔''

''تب پھر آپ اس سڑک پر کہاں سے آرہے تھے۔ جس پر محمود اور فاروق کو لفٹ دی گئی۔'' قدوائی صاحب غصے میں آگئے۔

''میں بتاتا ہوں جناب، انہیں باس کے منصوبے پر پوری طرح بھروسا نہیں تھا، لہٰذا یہ خود بھی اس سڑک پر پہنچ گئے جہاں ان دونوں کو اتارا جانا تھا؛ چنانچہ جب انہیں اتار دیا گیا تو یہ اپنی کار لے آئے اور ان دونوں کو لفٹ دی۔ محمود اور فاروق نے ان سے رحیم روڈ پر اترنے کے لیے ہی کہا تھا۔ اگر یہ کہیں اور اترنے کے لیے کہتے تو اسی وقت ان کے کان کھڑے ہو جاتے، لیکن جب انہوں نے یہ دیکھا کہ محمود اور فاروق شیخ صاحب کی کوٹھی کا رخ کر رہے ہیں تو انہوں نے جان لیا کہ محمود اور فاروق ان کے منصوبے پر پوری طرح عمل کرنے کے لیے تیار ہیں، لیکن ابھی ان کا

پوری طرح اطمینان نہیں ہوا تھا؛ چنانچہ یہ ہوٹل زوالو پہنچے۔ وہاں انہوں نے کمرہ نمبر ۲۱۵ کے ساتھ والا کمرہ پہلے ہی بک کرا رکھا تھا۔ اگرچہ یہ کمرہ کسی فرضی نام سے بک کرایا گیا ہوگا، لیکن ہوٹل کا عملہ اس بات کی گواہی دے گا کہ یہی وہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ تالے کے سوراخ میں سے یہ باہر کا جائزہ لیتے رہے۔ آخر انہوں نے محمود اور فاروق کو دروازے پر آتے دیکھا ، پھر البرٹ جان نے ڈبیا محمود کے ہاتھ سے لے لی۔ اس کے تھوڑی دیر بعد البرٹ جان باہر نکلا۔ اس کے ساتھ ہی سرور رضائی کمرے سے باہر نکلے تھے انہیں کیا معلوم تھا کہ میں برآمدے میں کھڑا ہوں۔ میں اس وقت میک اپ میں تھا؛ چنانچہ جب سرور رضائی نے اپنی آنکھوں سے البرٹ جان کو ایئر پورٹ کی طرف روانہ ہوتے دیکھ لیا، تب کہیں جا کر ان کا اطمینان ہوا، لہٰذا یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ مسٹر سرور رضائی ہی وہ آدمی ہیں جنہوں نے باس کے ذریعے ڈبیا اڑانے کا پروگرام بنایا۔ البرٹ جان وہ شخص ہے جو اس ڈبیا کی اطلاع لے کر یہاں آیا تھا۔ اس نے اس ہوٹل میں ہی سرور رضائی سے ملاقات کی اور انہیں بتایا کہ اس قسم کی ایک ڈبیا دشمن ملک سے یہاں بھیجی گئی ہے۔ اسے کسی نہ کسی طرح واپس حاصل کرنا ہے۔ باس کے بارے میں انہیں معلوم تھا کہ وہ ہسپتال کی آڑ میں ایسے گھناؤنے کام کر رہا ہے، لہٰذا انہوں نے اس سے مدد لینے کی ٹھانی۔ یہ ہے کل کہانی۔''

''کیوں مسٹر سرور، اب تم کیا کہتے ہو؟'' قدوائی صاحب بولے۔

''کچھ نہیں، میں بالکل بے گناہ ہوں۔ عدالت میں آپ لوگ میرے خلاف کچھ بھی ثابت نہیں کر سکتے۔''

''اچھی بات ہے، انہیں گرفتار کر لیا جائے۔ عدالت میں جرم میں خود

ثابت کروں گا۔''

جلد ہی اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں نظر آئیں۔ اس کی انگلیوں کے نشان لیے گئے۔ آخر اکرام واپس لوٹا۔ انگلیوں کے نشانات آپس میں ملائے گئے تو ان میں کوئی فرق نہ پایا گیا۔ اب انسپکٹر جمشید حوالات پہنچے۔ انہوں نے باس سے ملاقات کی اور اس سے کہا:

''سرور رضائی کو گرفتار کرلیا گیا ہے۔ یہ معلوم ہو چکا ہے کہ ڈبیا حاصل کرنے کا ٹھیکہ اسی نے تمہیں دیا تھا۔ اس نے غلطی یہ کی کہ خود ہی محمود اور فاروق کو لفٹ دینے سامنے آگیا، تاکہ انہیں اپنی آنکھوں سے آئی جی صاحب کی کوٹھی میں داخل ہوتے دیکھ لے۔ یہی نہیں، اس سے بھی بڑی غلطی اس نے یہ کی کہ ہوٹل زوالو میں البرٹ جان کے سامنے والا کمرہ کرائے پر لے لیا اور رحیم روڈ سے سیدھا وہاں پہنچ گیا۔ میں نے اسے وہاں سے نکلتے دیکھ لیا، ادھر اس نے محمود اور فاروق کو کار میں لفٹ دینے کے بعد بتایا تھا کہ وہ اپنے بیمار مریض کی عیادت کے لیے گیا تھا۔ لیکن اب اس بیمار عزیز کا نام بتا نہیں بتا سکا، لہٰذا اسے گرفتار کرلیا گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب تمہیں اس کے بارے میں کچھ چھپانے کی ضرورت نہیں۔''

''تو آپ نے سرور رضائی کو گرفتار کرلیا ہے۔ اب میں اس کا نام چھپا کر کیا کروں گا۔ ہمارے درمیان معاہدہ بھی ہوا تھا کہ میں کسی کو بھی اس کا نام نہیں بتاؤں گا، لیکن اب جب کہ وہ گرفتار ہو چکا ہے اور جرم بھی اس کا ثابت ہو چکا ہے، مجھے بھی چھپانے کی ضرورت نہیں رہی۔''

''ٹھیک ہے، تم اپنا تحریری بیان دے دو۔'' انہوں نے کہا۔

اس سے تحریری بیان لینے کے بعد وہ باہر نکلے۔ جیپ میں بیٹھتے ہوئے

بولے:

''اب وہ بچ نہیں سکتا۔ اس کے خلاف ثبوت بالکل مکمل ہوگیا ہے؛ گویا ہمارا کام بالکل ختم ہوگیا اور آج شام پھر جنگل کی سیر کو جاسکتے ہیں۔ یہ کیس سیر سے ہی شروع ہوا تھا۔''

''ہاں، سیر کے لیے ضرور جاؤ، کیونکہ سیر بہرحال مفید ثابت ہوتی ہے۔ لیکن میں یہ کہے بغیر نہیں رہوں گا کہ اس بار جو کام فرزانہ نے کر دکھایا، وہ نہ تم دکھا سکے اور نہ میں۔ اگر فرزانہ کمرے میں ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھ جاتی تو ہم اتنی آسانی سے باس تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔'' انسپکٹر جمشید بولے۔

''بس جی نصیب اپنا اپنا، یہ فرزانہ کی بچی ہر بار سہرا جیت لے جاتی ہے۔ نہ جانے اتنے سہروں کا یہ کیا کرے گی۔'' فاروق نے جل بھن کر کہا۔

''ابھی یہ کامیابی کے سہرے ہیں۔ ہزاروں لاکھوں کے لیے بھی جگہ کی ضرورت نہیں پڑتی۔ تم کیوں جلے جارہے ہو۔''

''جلتا ہے میرا جوتا۔'' فاروق پھاڑ کھانے لہجے میں بولا۔

''ہائیں، تو کیا تمہارے جوتے نے بھی فرزانہ کی جوتی کو دیکھ دیکھ کر رنگ پکڑ لیا ہے۔'' محمود ہنسا۔

''لو جوتے نہ ہوئے، خربوزے ہوگئے۔'' فرزانہ بول اٹھی۔

''دھت تیرے کی، دونوں کے پاس گھڑے گھڑائے جواب تیار ہیں۔'' محمود نے جھلا کر ران پر ہاتھ مارا۔

''تمہیں کس نے روکا ہے۔ تم بھی گھڑوا کر رکھ لو پانچ سات سو جواب۔'' فاروق نے منہ بنا کر کہا اور انسپکٹر جمشید مسکرانے لگے۔ اسی وقت فرزانہ زور سے چونکی۔

''ارے، لاحول ولا قوۃ۔''

''یہ لاحول کہاں سے ٹپک پڑا۔''

''ہم سب کے سب ایک بات تو بالکل ہی بھول گئے۔''

''کون سی بات بالکل بھول گئے اور تم یہ کس طرح کہہ سکتی ہو کہ ہم سب کے سب بھول گئے۔ ہو سکتا ہے، وہ بات ابا جان نہ بھولے ہوں۔'' محمود نے تلملا کر کہا۔

''نہیں، ابا جان بھی بھول گئے۔'' فرزانہ بولی۔

''اچھا، ذرا سنیں تو۔ وہ کیا بات ہے؟''

''نہیں بتاؤں گی۔ تم خود سوچو۔''

''اچھا یہ بات ہے۔'' محمود نے کہا اور سوچ میں ڈوب گیا۔ فاروق نے بھی ذہن پر زور ڈالا۔ محمود فوراً ہی بولا:

''ارے، واقعی ہم سب بھول گئے۔''

''بھئی آخر کیا بھول گئے؟''

''گھونگھا۔'' فرزانہ کے منہ سے نکلا۔

''گھونگھا، یعنی اس ڈبیا کو۔ ارے ہاں، یہ تو ہم نے پوچھا ہی نہیں کہ اس ڈبیا میں کیا ہے۔'' فاروق چونکا۔

''لیکن تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ میں بھی یہ بات بھول گیا تھا۔''

''تو کیا آپ کو یاد تھی یہ بات؟''

''ہاں، لیکن آئی جی صاحب سب لوگوں کے سامنے اس ڈبیا کا راز ظاہر نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے میں نے پوچھنا مناسب نہیں سمجھا اور تم گئے بھول، تم نے اس لیے نہیں پوچھا، لیکن تم فکر نہ کرو۔ دفتر پہنچتے ہی ہم پہلے ان

ے کمرے میں ہی چلیں گے۔''

آئی جی صاحب انہیں دیکھتے ہی مسکرائے اور بولے:

''میں جانتا تھا، تم لوگ ضرور آؤ گے۔ باس سے ملاقات کیسی رہی؟''

''بہت اچھی، اس نے اقرار کر لیا ہے کہ سرور رضائی نے ہی اسے یہ ام سونپا تھا۔''

''تو گویا اس کے خلاف ثبوت مکمل ہو گیا اور اب اس کا وکیل اسے بچا یں سکے گا۔''

''ہاں، آپ بے فکر رہیں اور اب مہربانی فرما کر ان تینوں کی بے چینی ع فرمائیں۔''

''اوہ ہاں، بھئی دراصل یہ ڈبیا دشمن ملک میں موجود ہمارے ایک اسوس نے ہمیں بھیجی تھی۔ اس میں ایک ایسی گیس کا فارمولا موجود ہے جو لک ترین ہتھیاروں سے محفوظ رکھے گی۔ ابھی یہ ڈبیا پروفیسر داؤد کے الے کرنے کی تجویز زیر غور ہے، منظوری ملتے ہی ان کے حوالے کر دی ئے گی۔''

''لیکن انکل، یہ کھلتی کیسے ہے؟''

''اس ڈبیا کو خاص سلوشن کے ذریعے بند کر دیا گیا ہے۔ اب اسے وفیسر داؤد ہی تجربات کرنے کے بعد کھول سکیں گے۔''

''اوہ، لیکن سوال یہ ہے کہ یہ دشمن ملک میں ہمارے جاسوس کے ہاتھ ہاں سے لگ گئی؟'' محمود نے پوچھا۔

''ہمارے جاسوس نے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا کہ یہ فارمولا ہمارے ن ملک نے اپنے ایک دوست ملک کے لیے بھیجا تھا۔ درمیان سے اڑا لیا

ہمارے جاسوس نے۔"

"ویری گڈ، جاسوس ہو تو ایسا۔" محمود چہک کر بولا۔

"جاسوس ہو تو ایسا، بھئی، یہ تو کسی ناول کا نام بھی ہو سکتا ہے۔" فاروق نے خوش ہو کر کہا۔

"ہو سکتا ہو گا، ہمیں اس سے کیا۔ ہم کوئی ناول نگار تو ہیں نہیں۔ اس کی ضرورت تو کسی ناول نگار کو ہو سکتی ہے۔" فرزانہ بھنائی۔

"بات تو یہ بھی ٹھیک ہے، لیکن تمہیں اتنی سی بات پر انگارے چبانے کی کیا ضرورت ہے۔ کبھی تو بغیر انگاروں کے بھی گذارا کر لیا کرو۔ اور نہیں تو کیا۔"

فاروق نے عورتوں کے سے انداز میں کہا اور وہ مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔ حد یہ کہ آئی جی صاحب بھی ہنس رہے تھے۔